Khaak-o-Khoon



نسیم حجازی

حصہ اول

دیباچہ

اس بوڑھے درخت کے نام

جو قریباً ایک صدی سے میرے گاؤں کی زندگی کا مرکز تھا۔ گاؤں کے بچے اس درخت کی شاخوں پر جھولا ڈالا کرتے تھے۔ گاؤں کے جوان اور بوڑھے اس کی گھنی اور ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھ کر پرانے وقتوں کی باتیں کیا کرتے تھے۔ اور عورتیں اس کے نیچے جمع ہو کر نئی دلہنوں کا استقبال کیا کرتی تھیں۔ یہ درخت گاؤں کے کئی بچوں کی جوانی اور جوانوں کا بڑھاپا دیکھ چکا تھا۔

شاہراہ حیات پر میری زندگی کے نقوش اس درخت کے نیچے پہنچ کر ماضی کے دھندلکوں میں روپوش ہو جاتے تھے۔ میں ایک ایسے سمندر کے کنارے رک جاتا ہوں۔ جس کی سطح پر لہروں کی شکنیں نہیں ہیں۔ لیکن اس کی گہرائیوں سے ہلکے، میٹھے اور نہ ختم ہونے والے نغمے بیدار ہوتے ہیں۔۔ میں ایسی فضاؤں میں کھو جاتا ہوں جن کی وسعتیں قوس وقزح کے رنگوں سے لبریز ہیں۔

ان نغموں کی دل کشی اور رنگوں کی دل فریبی کا موہوم سا تصور لے کر عالم شعور کی طرف لوٹتا ہوں۔ مجھے اس درخت کے پتوں کی سرسراہٹ سنائی دیتی ہے۔ میں اپنے ان ساتھیوں کو دیکھتا ہوں، جو بچپن میں میرے ساتھ کھیلا کرتے تھے۔ زندگی کے چہرے کی خفیف مسکراہٹیں اچانک قہقہوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔۔۔ میں

اس درخت کے نیچے کھڑا ہوں، اور اسے اپنی چھوٹی سی دنیا کی بلند ترین شے سمجھتا ہوں، مجھ سے بڑے لڑکے اس کی ٹہنیوں پر چڑھ کر مسرت کے قہقہے لگاتے ہیں، اور میں حیران ہو کر ان کی طرف دیکھتا ہوں۔ پھر میں ان دنوں کا تصور کرتا ہوں، جب کہ میں خود اس کی ٹہنی ٹہنی پر گھوم آیا کرتا تھا۔ اور مجھ سے چھوٹی عمر کے بچے میری طرف دیکھ کر پریشان ہوا کرتے تھے۔

ماضی حال کو اور حال مستقبل کو جنم دیتا ہے۔ اور بچپن کی مسکراہٹیں اور قہقہے جوانی کی دھڑکنوں، ولولوں اور امنگوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ پھر اچانک ایک دن زندگی کا یہ تسلسل ٹوٹ جاتا ہے۔ اس درخت کے پتوں سے پیدا ہونے والی دھیمی اور میٹھی راگنی ان لوگوں کی چیخوں میں دب کر رہ جاتی ہے۔ جنھوں نے اس کی چھاؤں میں ہنستا اور مسکرانا سیکھا تھا۔

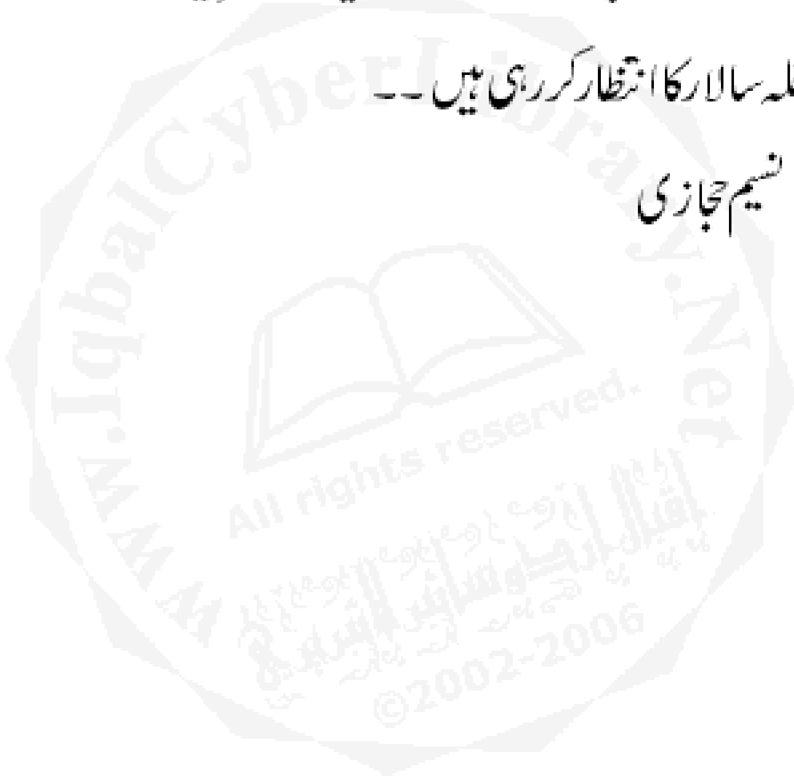
اگست ۴۷ء میں جب کہ مشرقی پنجاب کی ہزاروں بستیاں ''آگ اور خون'' کا طوفان دیکھ رہی تھیں۔ اس درخت کی جڑوں پر ان لوگوں کا خون بہہ رہا تھا، جو اسے پانی دیا کرتے تھے۔ اس کے نیچے ان جوانوں کی لاشیں تڑپ رہی تھیں، جو بچپن میں اس کی شاخوں پر جھولا ڈالا کرتے تھے۔۔۔ یہ میرے ساتھی، میرے عزیز اور میرے بزرگ تھے۔ ان کی لاشیں اس درخت کے پاس ہی ایک گڑھے میں دفن ہیں۔

اب میں خواب میں اس محفل کے بدلتے ہوئے رنگ دیکھا کرتا ہوں۔ جو ہمیشہ کے لئے ویران ہو چکی ہے۔۔ میں ان مسکراہٹوں کو نہیں بھول سکتا، جو زندگی کے معصوم چہرے سے ہمیشہ کے لئے چھین لی گئی ہیں۔ میرے کانوں میں اب بھی

وہی قہقہے گونجتے ہیں، جو ہمیشہ کے لئے خاموش ہو چکے ہیں۔ یہ درخت آج بھی اپنی جگہ کھڑا ہے۔

اگر میں ایک مغنی ہوتا اور اس درخت کی شاخ سے ایک بربط بنا سکتا تو میں فضائے بیکراں کو ان بے چین روحوں کی فریاد سے لبریز کر دیتا، جو اس درخت کے نیچے کسی قافلہ سالار کا انتظار کر رہی ہیں۔۔

نسیم حجازی



تعارف

بھارت نے تقسیم کے عمل اور پاکستان کے قیام کو کبھی دل سے قبول نہیں کیا۔اس کے حکمرانوں کی اولین کوشش یہ تھی کہ پاکستان کے لئے حالات اتنے ناسازگار بنا دیے جائیں کہ اس کی تعمیر کسی محکم بنا پر نہ ہو سکے۔اور جونہی موقع ملے اسے نیست و نابود کیا جا سکے۔خواہ فسادات کی آگ سے،خواہ اقتصادی حربوں سے،خواہ داخلی انتشار سے۔خواہ فوجی کاروائی سے۔

چنانچہ اگست ۱۹۴۷ء میں ہی مسلح ہندو اور سکھ جتھوں نے اتنے وسیع پیمانے پر مار دھاڑ اور آتش زنی کی کہ آناً فاناً سارا مشرقی پنجاب اس کی لپیٹ میں آ گیا۔اور پھر دہلی،اجمیر،یو پی کے شمالی اضلاع اور بھرت پور سے لے کر جموں و کشمیر تک کی تمام ریاستیں اس کی زد میں آ گئیں۔وہ آبادیاں جو صدیوں سے امن کی زندگی بسر کر رہی تھیں۔اور جن کے تصور میں بھی یہ قیامت خیز مناظر نہ تھے۔تباہ ہو گئیں،سارا نظام معشیت درہم برہم ہو گیا۔ہزاروں مرد،عورتیں اور بچے موت کے گھاٹ اتارے گئے۔لاکھوں بے گھر ہوئے اور ہجرت پر مجبور ہو گئے۔انہیں کے خون اور آنسوؤں سے پاکستان کی تعمیر ہوئی۔

یہی وہ حکایات خونچکاں ہیں جنھیں نسیم حجازی نے اپنے ناقابل فراموش ناول ''خاک وخون'' میں پیش کیا ہے۔ہماری موجودہ اور آنے والی نسلوں کے لئے ''خاک وخون'' کی اہمیت یہی نہیں کہ یہ دستان ہمارے ماضی کے بنیادی رو سے

تعلق رکھتی ہے اور اسے پڑھنے والے کے دلوں میں ۱۹۴۷ء کی ہولناکیوں کی یاد تازہ ہوتی رہے گی۔ اور وہ اس خطہ زمین کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ لگا سکیں گے، جو ہم نے بے مثال قربانیوں کے بعد حاصل کیا ہے۔ بلکہ یہ کتاب اس لحاظ سے بھی بہت اہم ہے کہ نسیم حجازی کی بصیرت نے قوم کو جن خطرات سے خبردار کیا تھا، وہ پوری شدت کے ساتھ ہمارے سامنے آچکے ہیں۔

تقسیم سے قبل اور تقسیم کے بعد آج تک ہماری آزادی اور بقا کے دشمنوں کا نصب العین اکھنڈ بھارت ہے۔ تاکہ عملاً سارے برِاعظم میں ہندو تہذیب و تمدن کی برتری کا سکہ رائج ہو سکے۔ اور وہ اس مقصد کی تکمیل کا کوئی موقعہ ضائع نہ کریں گے۔

پاکستان کے مسلمانوں کے اجتماعی احساس و شعور نے جنم دیا تاکہ وہ اپنے وطن میں اسلامی اقدار کی بنا پر ایک عادلانہ نظام برقرار رکھ سکیں۔ ہم اپنے ماضی کے ان بلند حوصلوں کے امین بن کر ہی اپنے حال اور مستقبل کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو سکتے ہیں۔ جن کی بدولت ۱۹۴۷ء میں "آگ اور خون" کے طوفان سے سرخرو ہو کر نکلے تھے۔ اس لئے ہمارے ماضی کی یہ داستان ہمارے مستقبل کے لئے ایک مستقل پیغام بھی ہے۔

محمد علی

(سابق وزیرِاعظم پاکستان)

۳۰ مارچ ۱۹۷۴ء

پہلا حصہ

مسکراہٹیں

اسماعیل رہٹ کے قریب آم کے درخت کے نیچے بیٹھا حقے کے کش لگا رہا تھا۔اس کا بڑا بھائی غلام حیدر باغ کے کونے سے نمودار ہوا اور کدال زمین پر رکھ کر اس کے قریب بیٹھتے ہوئے بولا" اسماعیل ذرا بیلوں کو ہانکتے رہو، ابھی آدھا کھیت باقی ہے۔اور اس کے بعد باغ کو بھی پانی دینا ہے۔

اسماعیل نے حقے کی نے غلام حیدر کی طرف پھیر دی اور اٹھ کر سست رفتار بیلوں کو دو چار سانٹے رسید کیے اور پھر وہیں آ کر بیٹھ گیا۔

غلام حیدر نے چند کش لگانے کے بعد کہا" تھوڑی دیر بعد کیاری بھی دیکھ آنا۔"

اسماعیل نے سوال کیا تم کہاں جا رہے ہو؟۔

"میں ذرا مجید کا پتا کر آؤں، کل ماسٹر نے پٹواری کے ہاتھ پیغام بھیجا تھا کہ وہ دو دن سے پھر غیر حاضر ہے۔آج میں نے اسے بہت پیٹا تھا۔"

اسماعیل نے مسکراتے ہوئے کہا" پیٹنے سے کوئی فائدہ نہیں، میرے خیال میں تم اس کے ساتھ ہی مدرسے میں داخل ہو جاؤ۔۔۔آج بھائی جان آئیں تو میں ان سے کہوں گا کہ اگر مجید کو پڑھانا ہے تو اس کی رکھوالی کے لئے اس کے باپ کا ساتھ ہونا ضروری ہے۔

''بھائی جان آج آئیں گے، تمہیں کس نے بتایا؟''۔

''ان کا نوکر ابھی آیا ہے۔وہ کہتا ہے کہ شام تک آجائیں گے۔یہ اچھا ہو گا ،شاید اس کے ساتھ مجید کو بھی پڑھنے کا شوق پیدا ہو جائے۔''

''لیکن سلیم ابھی بہت چھوٹا ہے، اور میں نے سنا ہے کہ یہ ماسٹر بہت مارتا ہے۔''

غلام حیدر کچھ کہنا چاہتا تھا کہ قریب کے ایک کھیت میں ہل چلانے والے کسان نے آواز دی ''غلام حیدر شاید تمہارا برخوردار آرہا ہے۔''

غلام حیدر اٹھ کھڑا ہوا، اور اسماعیل نے اس کی تقلید کی، اور دونوں سرسبز کھیتوں کے درمیان دوسرے گاؤں کو جانے والی پگ ڈنڈی کو دیکھنے لگے۔

پانچ چھ لڑکے گدھوں کو سرپٹ دوڑاتے چلے آرہے تھے۔یہ سوار لکھنے کی تختیوں سے چابک کا کام لے رہے تھے۔مجید سب سے آگے تھا۔کھیتوں میں کام کرنے والے کسان اٹھ اٹھ کر انہیں دیکھ رہے تھے۔گدھوں کا مالک ان کے پیچھے چلا آرہا تھا۔وہ آج خلاف معمول غضب ناک تھا۔اور انہیں گالیاں دے رہا تھا۔اور زمین سے ڈھیلے اٹھا اٹھا کر ان کی طرف پھینک رہا تھا۔

غلام حیدر کے چہرے پر غصے کے آثار نمودار ہوئے ،لیکن اسماعیل کا قہقہہ سن کر وہ بھی ہنس پڑا۔

رہٹ کے قریب پہنچ کر مجید گدھے سے کود پڑا، اور دوسرے بچوں نے بھی اس کی تقلید کی۔وہ سب گدھوں سے اترتے ہی اپنے گھروں کو بھاگ گئے۔لیکن باپ اور چچا کو دیکھ کر مجید نے بھاگنے کی جرات نہ کی۔

ان گدھوں کے مالک خیر دین کی اس وقت سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ ان شریر بچوں کے والدین جہاں بھی ہوں، اس کی گالیاں سنیں۔ لیکن یہ اس کی انتہائی بد قسمتی تھی کہ سانس تیز اور گلا خشک ہونے کے بعد اس کی آواز دور تک سنائی نہ دیتی تھی۔ اس کی پگڑی سر سے کھسک کر گلے کا ہار بن چکی تھی۔ رہٹ سے تھوڑی دور پہلے وہ کانٹوں کی باڑ میں الجھا، پھر پانی کی نالی میں گرا۔ غرض اس کے لئے وہ تمام اسباب پورے ہو چکے تھے۔ جنہیں مہذب سوسائٹی میں خودکشی کے لئے کافی سمجھا جاتا ہے۔ ایک گدھے نے آسمان کی طرف منہ اٹھا کر اپنا قومی ترانہ شروع کیا۔ لیکن خیر دین اس کی زندہ دلی کی داد دینے کی بجائے اس پر بے تحاشا لاٹھیاں برسانے لگا۔ لاٹھی ٹوٹ گئی اور خیر دین کا غصہ آدھا جاتا رہا۔

اسماعیل ہنسی ضبط کرتے ہوئے آگے بڑھا اور بولا ''خیرو آج میں ان سب کی خبر لوں گا یہ تمہیں بہت تنگ کرتے ہیں۔''

غلام حیدر سانٹا ہاتھ میں لیے ہوئے مجید کی طرف بڑھا، لیکن اسماعیل نے بھاگ کر اسے روک لیا۔ اور مجید کی طرف متوجہ ہو کر کہا، مجید تم کان پکڑو۔ اور مجید نے جھٹ کان پکڑ لیے۔

غلام حیدر اور اسماعیل کے سامنے خیر دین کا غصہ اور کم ہو چکا تھا۔ وہ پگڑی کو گردن سے اتار کر سر پر لپیٹتے ہوئے بولا۔ ''چودھری جی میں نے انہیں کبھی منع نہیں کیا۔ جب مجھے کام نہیں ہوتا تو میں پرواہ نہیں کرتا۔ لیکن آج میں نے پورن ماشی کے میلے میں برتن لے جانے تھے۔ پچھلے دو تین ہفتے کام کی وجہ سے میں نے ان کا داؤ

نہیں چلنے دیا۔ جب انہیں مدرسے سے چھٹی ہوتی ہے تو میں گدھوں کی رکھوالی کیا کرتا ہوں۔ لیکن آج یہ چھٹی سے پہلے آ گئے۔ میں بھٹی سے برتن نکال رہا تھا۔ کہ یہ گدھوں کو لے اڑے۔ پہلے انہوں نے گاؤں کے گرد چکر لگائے۔ پھر نہر کا رخ کیا۔ جب یہ واپس آ رہے تھے، تو میرا خیال تھا کہ اب یہ میرے حال پر رحم کریں گے۔ میں ان کا راستہ روکنے کے لئے بھاگا۔ لیکن یہ مجھے دیکھ کر کترا کر اس طرف نکل آئے۔

اسماعیل نے کہا اچھا خیرو! آئندہ انھوں نے ایسی حرکت کی تو سیدھا میرے پاس آنا۔ اب تم وہ درانتی اٹھاؤ اور اپنے گدھوں کے لئے اس کھیت میں سے چارہ کاٹ لو۔''

خیر دین اب غصے کی بجائے تشکر کے جذبات سے مغلوب ہو رہا تھا۔ اس نے درانتی اٹھانے سے پہلے آگے بڑھ کر مجید کو اٹھایا اور کہا ''دیکھو بھئی آج تم نے مجھے بہت پریشان کیا ہے۔ جب تمہیں سواری کا شوق ہو تو میرے پاس آ جایا کرو۔ لیکن خدا کے لئے اسکول کے تمام بچوں کو لے کر نہ آیا کرو۔

مجید تذبذب کی حالت میں باپ اور چچا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اتنے میں کسی نے باغ کے دوسرے سرے سے آواز دی۔ ''مجید! او مجید!!۔

مجید اجازت طلب نظروں سے اپنے باپ اور چچا کی طرف دیکھنے لگا۔ اسماعیل نے کہا جاؤ نالائق!''۔

مجید جلدی سے تختی اور بستہ اٹھا کر گاؤں کی طرف بھاگنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ

ایک کم سن لڑکا ٹٹو کی ننگی پیٹھ پر سوار باغ کی اوٹ سے نمودار ہوا۔ مجید کے قریب پہنچ کر اس نے ٹٹو کو روکا۔

اسماعیل نے کہا "سلیم اترو نیچے میں نے تمھیں کئی بار منع کیا ہے"۔

سلیم نے اس کے حکم کی تعمیل کرنے کی بجائے جلدی سے باگ موڑ کر ٹٹو کو ایڑ لگا دی۔ ٹٹو نے جست لگا کر پانی کی کھائی عبور کی اور سرپٹ بھاگنے لگا۔

اسماعیل چلایا، سلیم اسے روکو۔ بیوقوف گر پڑو گے"۔ لیکن سلیم نے رفتار اور تیز کر دی۔۔۔ جب ٹٹو نے کھیت کی باڑ کے اوپر سے چھلانگ لگائی تو وہ گرتے گرتے بچا۔ اسماعیل اور غلام حیدر دم بخود ہو کر اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ کوئی دو فرلانگ دور جا کر اس نے باگ موڑ لی۔ مجید بھاگتا ہوا پگڈنڈی کے قریب آ کھڑا ہوا۔ واپسی پر بھی ٹٹو کی رفتار وہی تھی۔

مجید کو رستے میں دیکھ کر سلیم نے ٹٹو کو روکا۔ اسے کھیت کی مینڈ کے ساتھ کھڑا کرتے ہوئے کہا، مجید جلدی سے میرے پیچھے بیٹھ جاؤ۔ آج میں تمھیں بہت عجیب چیز دکھاؤں گا۔

مجید مینڈھ پر پاؤں رکھ کر اس کے پیچھے سوار ہو گیا۔ دور سے غلام حیدر نے آواز دی "۔سلیم اب نہ بھگانا اسے، تم دونوں گر پڑو گے۔

"نہیں چچا اس نے جواب دیا"۔



گاؤں کی دوسری طرف ایک جوہڑ کے کنارے چند جھاڑیوں کے قریب پہنچ کر سلیم اور مجید ٹٹو سے اترے۔ مجید نے لگام ایک ٹہنی کے ساتھ باندھ دی۔ اور سلیم سے پوچھا؟۔ یہاں کیا دکھاؤ گے مجھے؟۔

سلیم نے کہا پہلے وعدہ کرو کہ تم انھیں مارو گے نہیں !؟۔

کسے؟۔

''یہ پھر بتاؤں گا پہلے وعدہ کرو''

''اچھا میں انہیں نہیں ماروں گا''۔

''یہ بھی وعدہ کرو کہ تم انہیں اٹھا کر گھر نہیں لے جاؤ گے''

''اچھا''

سلیم نے تھوڑی دیر سوچنے کے بعد کہا ''نہیں میں تمھیں نہیں دکھاؤں گا ،تم دوسرے لڑکوں کو بتا دو گے''۔

''نہیں میں کسی کو نہیں بتاؤں گا''۔

''اچھا آؤ''

مجید سلیم کے پیچھے ہولیا۔سلیم ایک جھاڑی کے قریب رکا اور ٹہنیوں کے درمیان ایک چھوٹے سے گھونسلے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔''وہ دیکھو فاختہ بیٹھی ہے۔''مجید نے کہا واہ جی یہ کون سی عجیب بات ہے۔ ہمارے باغ میں بہت سی فاختائیں ہوں گی۔

سلیم نے کہا ''تم نے ابھی کچھ نہیں دیکھا، ارے اس نے بچے نکالے ہیں۔

چھوٹے چھوٹے دو بچے''۔

سلیم آگے بڑھا، فاختہ اڑ گئی۔ اس نے آہستہ سے ایک بچہ اٹھایا، اور اسے ہتھیلی پر رکھ کر مجید سے کہا ''پرسوں تک یہ دونوں انڈوں میں تھے۔ چند دنوں تک ان کے پر نکل آئیں گے۔ پھر یہ اپنی ماں کے ساتھ اڑا کریں گے۔

مجید نے کہا۔ ''واہ جی میں نے جیسے پہلے کبھی فاختہ کے بچے نہیں دیکھے، میں سمجھتا تھا تم نے کوئی عجیب شے دیکھی ہے۔ چلو گھر چلیں''۔

مجید کی اس بے اعتنائی پر سلیم پریشان ہو رہا تھا۔ اس نے بچے کو گھونسلے میں رکھ دیا تھا۔

☆☆☆☆☆

یہ بچے جب واپس گاؤں پہنچے تو شام ہو چکی تھی۔ سلیم نے باہر کی حویلی میں داخل ہو کر ٹٹو کو نوکر کے حوالے کیا۔ نوکر نے ٹٹو کی پیٹھ پر تھپکی دیتے ہوئے ''سلیم جی تمہارے چچا مجھ پر بہت خفا ہوئے ہیں۔ اگر تم گر پڑتے تو میری شامت آجاتی۔ آئندہ میں تمہارے چچا کی اجازت کے بغیر اس ٹٹو کو ہاتھ نہیں لگانے دوں گا۔''

سلیم کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن اسے اچانک حویلی میں ایک خوب صورت گھوڑا دکھائی دیا اور وہ خوشی سے اچھل پڑا۔ ''مجید ابا جان آ گئے'' وہ دیکھو ان کا گھوڑا! وہ یہ کہتا ہوا حویلی کی طرف بھاگا۔ گھوڑے نے اسے دیکھتے ہی کان کھڑے کر لیے۔ اس کے نتھنوں کی آواز کہہ رہی تھی کہ میں تمہیں پہچانتا ہوں۔ سلیم قریب پہنچا تو

گھوڑے نے گردن ذرا نیچے کرلی ۔اور وہ اس کی پیشانی اور نتھنوں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔مجید چند قدم دور کھڑا رہا۔

سلیم نے کہا مجید تم اس سے ڈرتے ہو؟۔

مجید نے کہا یہ مجھے کاٹتا ہے۔

سلیم کی وہ پریشانی جس کا باعث فاختہ کے بچے کے متعلق مجید کی بے توجہی تھی، اب دور ہوچکی تھی ۔اب اسے اس بات کا خطرہ نہ تھا کہ مجید گھر جا کر دوسرے بہن بھائیوں کے سامنے اس کا مذاق اڑائے گا۔اس نے فخریہ لہجے میں کہا۔اس سے گاؤں کے سب بچے ڈرتے ہیں۔میں نہیں ڈرتا''۔

''تم اس لئے نہیں ڈرتے کہ یہ تمہیں کاٹتا نہیں۔''

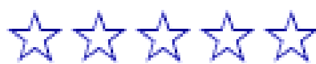
''تم جانتے ہو کہ یہ مجھے کیوں نہیں کاٹتا؟۔

مجید نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا اچھا بتاؤ،یہ تمہیں کیوں نہیں کاٹتا؟۔

''میں اسے چنے اور گڑ کھلایا کرتا ہوں۔''

''میں بھی اسے چنے اور گڑ کھلایا کروں گا۔سلیم تم کہتے تھے کہ تمہارے ابا جان گیند لائیں گے؟۔

''ہاں وہ گیند لائیں ہوں گے چلو گھر چلیں!''۔



اس حویلی میں مویشیوں کے باندھنے کے کمرے اور بھوسے اور اناج کے گودام تھے۔اس کے علاوہ کاشت کاری کا سامان بھی یہاں رکھا جاتا تھا۔ایک کونے میں چھپر کے نیچے چارا کاٹنے کی مشین تھی۔صحن کے وسط میں آم کے دو درختوں کے درمیان گنے کا رس نکالنے کی مشین تھی۔دوطرف کی دیواروں کے ساتھ مویشیوں کے لئے کھرلیاں بنی تھیں۔ایک کونے میں گڑ بنانے کی بھٹی تھی۔

باہر کے پھاٹک کی مقابل کی دیوار کے درمیان پکی اینٹوں سے بنی ہوئی ڈیوڑھی اور اس کے ساتھ بیٹھک تھی۔بیٹھک اور ڈیوڑھی کے دائیں بائیں کچے بر آمدے تھے۔ڈیوڑھی سے آگے دوسری حویلی تھی۔جس میں پکی اینٹوں کے بنے ہوئے مختصر مگر صاف ستھرے رہائشی مکان تھے۔بیٹھک کا ایک دروازہ گھر کے صحن اور دوسرا ڈیوڑھی میں کھلتا تھا۔

مجید اور سلیم جب ڈیوڑھی میں داخل ہوئے تو بیٹھک سے گھر کے آدمیوں کی آوازیں سنائی دیں۔مجید نے رک کر کہا تم جاؤ۔میں گھر جاتا ہوں۔

سلیم نے دروازے میں کھڑے ہو کر اندر جھانکا،بیٹھک میں لیمپ جل رہا تھا۔اور چارپائیوں پر اس کے دادا کے علاوہ گھر کے آٹھ،دس آدمی بیٹھے تھے۔یہ اطمینان کرنے کے بعد کہ اسے کسی نے نہیں دیکھا،سلیم جھک کر ایک چارپائی کے نیچے گھس گیا۔اور رینگتا ہوا اس چارپائی کے نیچے جا پہنچا،جس پر اس کے ابا اور دادا بیٹھے ہوئے تھے۔اس نے اپنی کمر کے ساتھ چارپائی کو اوپر اٹھانے کی کوشش کی،اور پھر دبک کر نیچے لیٹ گیا۔چارپائی اگرچہ ہل نہ سکی تاہم سلیم کا مقصد پورا ہو چکا تھا۔

اس کا دادا کہہ رہا تھا۔ ''علی اکبر ذرا چار پائی کے نیچے دیکھنا، شاید کوئی کتا اندر آ گیا ہے۔

سلیم بڑی مشکل سے اپنی ہنسی ضبط کر رہا تھا۔ علی اکبر نے نیچے جھانک کر ہنستے ہوئے کہا ''۔ کتا نہیں ریچھ ہے جی''۔

سلیم اب پوری طاقت سے چار پائی اوپر اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

دادا نے کہا یہ ریچھ نہیں شیر ہے۔ علی اکبر پھر دیکھنا۔

سلیم قہقہہ لگاتا ہوا باہر نکل آیا۔ علی اکبر نے اسے پکڑ کر گود میں بٹھا لیا۔

دادا نے کہا ''علی اکبر بھئی اپنے بیٹے کو ساتھ ہی لے جایا کرو۔ یہ ہمیں بہت ستاتا ہے۔

علی اکبر نے کہا میاں جی اب یہ چھ برس کا ہو گیا ہے۔ گزشتہ سال آپ نہیں مانتے تھے۔ لیکن اب اسے سکول میں بھیج دینا چاہیئے۔ ورنہ یہ آوارہ ہو جائے گا۔ میں صبح خود جا کر اسے اسکول چھوڑ آؤں گا۔

سلیم کے قہقہے حلق میں اٹک کر رہ گئے، اور جب اس کے دادا نے یہ کہہ دیا۔ '' پچھلے سال یہ اس قابل نہیں تھا۔ لیکن اب میں تمہیں منع نہیں کرتا۔'' تو سلیم نے محسوس کیا کہ اب اس فیصلے پر آخری مہر لگ چکی ہے۔

سلیم نے اسکول کے متعلق اب تک یہی سنا تھا کہ وہاں بچوں کو بری طرح مارا پیٹا جاتا ہے۔ اس کے چچا حیدر اور اسماعیل نے متواتر چار سال ماسٹروں کی مار کھائی تھی۔ گاؤں کے لوگ جب گرمیوں کی دوپہروں میں درختوں کی چھاؤں میں اور

سردیوں میں آگ کے الاؤ کے گرد بیٹھ کر جب پرانے وقتوں کی باتیں کرتے تو چچا اسماعیل اور غلام حیدر کی طالب علمی کے زمانے کا ذکر بھی آجاتا تھا۔وہ خود اس بات کی تصدیق کیا کرتے تھے کہ ماسٹر کان پکڑوا کر ان کی پیٹھ پر اینٹیں رکھ دیا کرتا تھا۔وہ گنے کے کھیتوں میں چھپا کرتے تھے۔لیکن خاندان کے بزرگوں کی طرح شاید گاؤں کے باقی لوگوں کو بھی ان سے دشمنی تھی۔وہ انہیں پکڑ کر ماسٹر جی کے حوالے کر آیا کرتے تھے۔اس کا چچا زاد بھائی مجید اور دوسرے لڑکے بھی اسے اسکول سے واپس آ کر بہت کچھ بتایا کرتے تھے۔مجید دو سال سے پہلی جماعت میں تعلیم پا رہا تھا۔وہ سلیم کے بڑے چچا غلام حیدر کا بیٹا تھا۔وہ درخت پر چڑھنے، پانی میں تیرنے اور کھیل کود میں گاؤں کے تمام لڑکوں سے زیادہ ہوشیار تھا۔اس میں سینکڑوں خوبیاں تھیں۔لیکن سلیم حیران تھا کہ اس کے باوجود ماسٹر اس پر رحم نہیں کرتا تھا۔سلیم نے کئی بار اپنی آنکھوں سے اس کی پیٹھ پر ڈنڈوں کے نشان دیکھے تھے۔اگر چچا غلام حیدر کا بس چلتا تو وہ اس کی مرضی کے خلاف اسے سکول جانے پر مجبور نہ کرتا۔لیکن سلیم کا والد اپنے بھائیوں میں سب سے بڑا تھا۔اور وہ خاندان کے بچوں کی تعلیم کے بارے میں بہت سخت تھا۔دادا کے بعد خاندان میں سب سے زیادہ اسی کا حکم مانا جاتا تھا۔اور اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد نائب تحصیلدار بن چکا تھا۔

سکول جانا اور ماسٹر سے مار کھانا، ورنہ گھر سے مار کھانا بیچارے مجید کے لئے ایک مجبوری تھی۔اور سلیم کو اس بات کا افسوس تھا کہ اس کی مجبوری کا باعث اس کے

اپنے ابا جان ہیں۔

سلیم نے جنوں، بھوتوں اور چڑیلوں کی کہانی سنی تھیں۔ لیکن سکول ماسٹر اس کے لئے سب سے زیادہ خوفناک شے کا نام تھا۔ اس نے سنا تھا کہ بادشاہ سب سے بڑا ہوتا ہے۔ وہ جسے چاہے مار سکتا ہے۔ وہ ایک بادشاہ بننا چاہتا تھا۔

بچوں کو ماسٹروں سے نجات دلانے کی یہی ایک صورت تھی۔ لیکن اب وہ خود سکول جا رہا تھا۔ جو کچھ ابا نے بیٹھک میں کہا تھا۔ اب سارے گھر میں مشہور ہو چکا تھا۔ ماں نے اس کے لئے نئے کپڑے اور نئے بوٹ منگوا رکھے تھے۔ اس کی چچیاں، پھوپھیاں اور بہنیں سب خوش تھیں۔ اور خاندان میں صرف ایک دادی تھی، جس کو اس کے ساتھ ہمدردی تھی۔ صرف اس نے ماسٹر کے متعلق تشویش کا اظہار کیا تھا۔ صرف اس نے کہا تھا، بیٹا تم فکر نہ کرو۔ ماسٹر تمہیں کچھ نہیں کہے گا۔"

گاؤں کے بچے باہر کھیل رہے تھے۔ وہ اسے بلانے کے لئے آئے۔ لیکن اس نے جانے سے انکار کر دیا۔ لیکن وہ اسے کھینچ کر لے گئے۔ جب وہ ڈیوڑھی کے قریب پہنچا تو ماں نے آواز دی، بیٹا سلیم جلدی آ جانا، صبح تمہیں سکول جانا ہے۔ سلیم نے کوئی جواب نہ دیا۔

اس کے ساتھی باہر نکلتے ہی شور مچانے لگے کہ سلیم کل سکول جا رہا ہے۔ اب باقی بچے بھی کھیل کا خیال چھوڑ کر اس کے گرد جمع ہو گئے۔ کیوں سلیم؟ کیا یہ سچ ہے۔ کیا سچ مچ تم سکول جا رہے ہو۔ اور پھر جب ان کی تسلی ہو گئی تو انہوں نے مجید کی تجویز پر آنکھ مچولی، کبڈی یا چور اور کوتوال کی بجائے ماسٹر اور لڑکوں کا کھیل کھیلنے کا فیصلہ کیا۔

مجید ماسٹر بن گیا۔اس نے بچوں کو ایک قطار میں کھڑا کر کے کان پکڑنے کا حکم دیا۔

سکول کے تربیت یافتہ بچوں نے فوراً کان پکڑ لیے۔اور دوسروں کو مجید نے اپنے گرد جمع کر کے اس فن کی مشق کرائی۔وہ کہہ رہا تھا، دیکھو میری طرف۔اس طرح جھکو، پھر گردن نیچی کرو۔پھر ہاتھوں کو اس طرح لے جاؤ اور کان پکڑ لو۔پیٹھ اونچی رکھنا ضروری ہے۔ورنہ ڈنڈے پڑیں گے۔باتیں مت کرو۔اور دھوبی کے لڑکے یہ مدرسہ ہے۔کہ تیرے باپ کا گھر ہے۔ہنسو نہیں، ورنہ دانت توڑ دوں گا۔

تمام بچے کان پکڑ چکے تھے۔لیکن سلیم کھڑا تھا۔مجید نے کہا اے تم نے کان نہیں پکڑتے۔۔۔۔؟۔

سلیم نے غصے سے کانپتے ہوئے کہا ''میں کان نہیں پکڑوں گا''۔اور پیشتر اس کے کہ مجید کچھ کہتا، وہ گھر کی طرف بھاگ رہا تھا۔۔

گھر پہنچ کر سلیم کسی سے بات کیے بغیر لیٹ گیا۔امینہ اس کی چچا زاد بہن جو اس کی ہم عمر تھی۔اس کے پاس آ بیٹھی۔اور اس نے کہا سلیم چلو دادی جان سے کہانی سنیں۔

نہیں اس نے بے رخی سے جواب دیا۔

وہ سلیم کو بازو سے پکڑ کر کھینچنے لگی۔سلیم نے جھلا کر کہا ''جاؤ چڑیل ورنہ بال نوچ ڈالوں گا۔''

امینہ مایوس ہو کر چلی گئی۔تھوڑی دیر کے بعد سلیم کی ماں آئی اور بولی ''سلیم تم یہاں ہو، میں سمجھتی تھی کہ تم باہر بچوں کے ساتھ کھیل رہے ہو گے۔تم نے آج دودھ

نہیں پیا۔ میں لاتی ہوں۔

وہ دودھ کا گلاس لے آئی۔ لیکن سلیم نے دودھ پینے سے انکار کر دیا۔ ماں نے اصرار کیا تو وہ بستر سے اٹھ کر بھاگتا ہوا مکان کی چھت پر چڑھ گیا۔ وہ کچھ دیر چھت کی منڈیر پر بیٹھا رہا۔ اور آہستہ آہستہ ایک طرف چل دیا۔

حویلی کے تمام مکانوں کی چھتیں آپس میں ملی ہوئی تھیں۔ وہ ان پر سے گزرتا ہوا ایک کونے میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ پچھواڑے میں آم اور جامن کے کچھ درخت تھے۔ ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکوں سے ان میں سرسراہٹ پیدا ہو رہی تھی۔ چاند کی روشنی میں چھت پر ان کے سائے بھی ہلتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ گاؤں کے کتے کوٹھے پر چڑھ کر بھونک رہے تھے۔ اور کھیتوں سے گیدڑوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

تھوڑی دیر وہاں کھڑا رہنے کے بعد سلیم چند کمروں کی چھت پر سے گزرتا ہوا اس کونے میں جا کھڑا ہوا۔ جہاں رہائشی مکانوں کی چھت مویشیوں کی حویلی کے برامدے کے ساتھ ملتی تھی۔ یہاں اسے وہ جوہڑ دکھائی دے رہا تھا۔ جس کا کنارہ باہر کی حویلی کی دیوار سے ملتا تھا۔ اس جوہڑ کے دوسرے سرے پر شیشم کے درخت تھے۔ اور جوہڑ کے پانی میں ان کا عکس نظر آتا تھا۔ اچانک اسے اپنے باپ کی آواز سنائی دی:

سلیم، سلیم!

اس نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا۔ اس کا باپ مکان کی چھت کے دوسرے سرے پر کھڑا تھا۔

آیا ابا جان!" یہ کہہ کر وہ بھاگتا ہوا اس کے پاس جا کھڑا ہوا۔

باپ نے کہا سلیم بیٹے یہاں اکیلے کیا کر رہے ہو؟۔

کچھ نہیں ابا جان۔

"تمہاری ماں کہتی ہے کہ تم سکول ماسٹر سے بہت ڈرتے ہو۔؟۔

سلیم خاموش رہا۔

علی اکبر نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا، بیٹا تمہیں کسی نے یونہی ڈرا دیا ہے۔ ماسٹر اچھے بچوں کو نہیں مارا کرتے۔ صرف وہی بچے پٹتے ہیں، جو کام نہیں کرتے۔ میں بھی اسی سکول میں پڑھا کرتا تھا۔ لیکن میں نے ایک دن بھی مار نہیں کھائی۔ استاد اچھے لڑکوں کو تو پیار کرتے ہیں۔ تمہارا فرض ہے کہ تم دل لگا کر پڑھو۔ تم ساری عمر کھیل کود میں نہیں گزار سکتے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم بڑے آدمی بنو۔ اب میں تمہیں سارا دن گاؤں کے بچوں کے ساتھ آوارہ گردی کی اجازت نہیں دوں گا۔ تمہیں دنیا میں نام پیدا کرنا ہے۔ اس سکول کے بعد تم شہر کے بڑے سکول میں جاؤ گے۔ پھر کالج جاؤ گے۔ پھر تمہیں بہت دور ولایت جانا پڑے گا۔"

جب سلیم نیچے اتر کر بستر پر لیٹ گیا تو اس کی ماں گھر کے کام کاج سے فارغ ہو کر اسے تسلی دینے آئی۔ اس نے کہا بیٹا ماسٹر تمہیں نہیں مارے گا۔ میں تمہیں روز کا سبق یاد کرا دونگی۔ تمہیں وقت پر سکول بھیج دیا کرونگی، تمہیں صاف ستھرے کپڑے پہنایا کروں گی۔ اس کے باوجود بھی اگر اس نے تمہیں پیٹا تو تمہارا باپ اس کی مرمت کرے گا۔

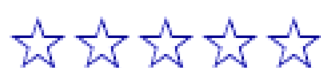
سلیم کو اپنے مستقبل کے متعلق کافی اطمینان ہو چکا تھا۔تاہم اسے دیر تک نیند نہ آئی۔بار بار اسے یہ خیال آ رہا تھا کہ اب میں بڑا ہو گیا ہوں۔اب میں گاؤں کے بچوں کے ساتھ نہیں کھیل سکوں گا۔ابا جان کہتے ہیں کہ میں بڑا آدمی بنوں۔وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ بڑا آدمی کیا ہوتا ہے؟۔وہ کیا مجبوری ہے کہ پہلے اسے ساتھ والے گاؤں کے سکول، پھر اس سے دور شہر کے سکول اور اس کے بعد کہیں بہت دور جانا پڑے گا۔اب تک وہ یہی سمجھتا تھا کہ وہ سب چیزیں جن کی وہ خواہش کر سکتا ہے۔اس کے گاؤں میں موجود ہیں۔اس کے گاؤں میں سر سبز درخت جھومتے تھے۔پھول کھلتے تھے۔ہوائیں چلتی تھیں۔بادل آتے تھے۔سر سبز کھیت لہلہاتے تھے۔

یہاں اس کے پرندے اڑتے تھے۔چڑیاں چہچہاتی تھیں۔

یہاں آم، انار، نارنگی، امرود اور ناشپاتی کے باغات تھے۔زمین پر اس کی ندیاں تھیں۔اس کی جھیلیں تھیں۔یہاں سے وہ ان پہاڑوں کو دیکھ سکتا تھا۔جن کی چوٹیاں برف سے ڈھکی رہتی تھیں۔اور آسمان پر اس کا سورج تھا۔اس کا چاند اور تارے تھے۔اسے کسی سے یہ سننا گوارہ نہ تھا کہ اب تم بڑے ہو گئے ہو۔وہ تمام عمر اپنی دنیا کو ایک بچے کی آنکھ سے دیکھنا چاہتا تھا۔اس کے لئے زندگی اس وقت کتنی مکمل تھی، جب وہ اپنے مکان کی چھت سے چاروں طرف نگاہ دوڑانے کے بعد یہ محسوس کرتا تھا کہ زمین ایک گول دائرہ ہے۔جس کا کنارہ حد نظر سے آگے آسمان کے گنبد سے جا ملتا ہے۔اور اس کا گھر اس گول دائرے کا مرکز ہے۔یہ دنیا اس وقت

کتنی مختصر اور حسین تھی۔ جب وہ اپنے بازو پھیلا کر کہتا تھا کہ سورج اتنا بڑا ہے۔ چاند صرف اتنا ہے۔ اور ستارے اس قدر چھوٹے ہیں۔ وہ اپنی معلومات پر کس قدر مطمئن تھا۔ جب وہ اپنے ساتھ کھیلنے والے بچوں کو سمجھایا کرتا تھا۔ کہ چاند، سورج اور ستارے بھی ہماری طرح آنکھ مچولی کھیلتے ہیں۔ شام کے وقت سورج آسمان سے اتر کر زمین کے کسی جنگل میں روپوش ہو جاتا ہے۔ چاند اور ستارے اسے ساری رات تلاش کرتے ہیں۔ لیکن وہ درختوں کی آڑ لیتا ہوا زمین کی دوسری طرف پہاڑوں میں پہنچ جاتا ہے۔ صبح کے وقت کوئی ہوشیار ستارہ اسے چھولیتا ہے۔ پھر ستارے کہیں چھپ جاتے ہیں، اور سورج دن بھر انہیں تلاش کرتا ہے۔

وہ کس قدر مسرور تھا۔ جب وہ یہ سمجھتا تھا کہ بادل آسمان کے وہ گھوڑے، اونٹ اور ہاتھی ہیں۔ جن پر فرشتے سواری کرتے ہیں۔ اور پہاڑ ان عجیب وغریب جانوروں کی چراگاہیں ہیں۔ لیکن بڑوں کی باتوں نے اسے اپنے خیالات تبدیل کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اب اس کے لئے چاند اور ستارے وہ کھلونے نہ تھے۔ جن کی طرف وہ ماں کی گود میں بیٹھ کر ہاتھ بڑھایا کرتا تھا۔ بادل وہ عجیب وغریب جانور نہ تھے، جن پر سواری کرنے کی تمنا اس کے دل میں چٹکیاں لیا کرتی تھیں، وہ یہ محسوس کرتا تھا کہ جوں جوں وہ بڑا ہوتا جائے گا۔ کائنات کے حسین اور دلفریب چہرے سے نقاب اترتے جائیں گے۔



ماسٹر جی حقہ پیا کرتے تھے، کھانسا کرتے تھے اور بچوں کو پیٹا کرتے تھے۔ انہیں زندگی کی ہر تلخی گوارہ تھی، لیکن بچوں کا ہنسنا اور بولنا اور ادھر ادھر دیکھنا ان کی قوت برداشت سے باہر تھا۔ محکمہ تعلیم کی بیس سالہ خدمت نے انہیں اس دنیا میں مسکرانے اور ہنسنے والی انسانی صورتوں سے نفرت کرنا سیکھا دیا تھا۔ انہیں پندرہ یا بیس روپے ماہوار پر ملازمت ملی تھی۔ اور انہیں ایک روپیہ فی سال کے حساب سے ترقی مل رہی تھی۔ لیکن اس ترقی کے مقابلے میں ان کا جسمانی اور ذہنی انحطاط کہیں زیادہ تیز تھا۔ جب انہوں نے ملازمت شروع کی تھی تو وہ تنہا تھے۔ اس کے بعد ان کی شادی ہوئی۔ اور اب وہ چھ بچوں کے باپ تھے۔ اور پھر ان سے چند ایسی غلطیاں بھی ہوئیں، جن کی سزا ہر شریف آدمی کو ملتی ہے۔ ایک دفعہ انسپکٹر صاحب معائنہ کے لیے تشریف لائے۔ تو ماسٹر جی نے انہیں مرغی کھلانے کی بجائے دال پیش کر دی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دو سال تک ان کی ترقی رکی رہی۔ اس کے بعد ایک اور انسپکٹر ان سے خفا ہوا تو اس نے بھی ایک سال کے لئے ان کی ترقی روک دی۔ غرض اس طرح بیس سال کی ملازمت کے دوران تین سال تک ان کی ترقی بند رہی۔

ماسٹر جی سے ایک گناہ اور بھی ہوا تھا کہ انھوں نے اپنی مستقل رہائش کے لئے اس گاؤں میں ایک چھوٹا سا مکان بنوالیا تھا۔ کسی طرح انسپکٹر صاحب کو اس بات کا علم ہو گیا۔ اور انہوں نے جھٹ ان کی تبدیلی کا حکم صادر فرما دیا۔ اب گاؤں میں کوئی مکان کا خریدار نہ تھا۔ ماسٹر جی نے منت وزاری کی، لیکن انسپکٹر صاحب نہ مانے۔ جب انھوں نے آنسو اور آہیں بے کار دیکھیں تو مرغیوں، گھی اور انڈوں سے

کام لیا۔

یہ انسپکٹر صاحب تبدیل ہوتے ہوئے، تو جاتے جاتے اپنے جانشین کو ماسٹر کی زندگی کے اس کمزور پہلو کا پتہ دے گئے۔ چنانچہ ماسٹر جی کا اندازہ تھا کہ اگر وہ ساٹھ سال کی عمر تک وفات نہ پا گئے تو اس مکان کی قیمت کے برابر مرغیاں اور انڈے انسپکٹروں اور کلرکوں کو بطور ٹیکس دینا پڑیں گے۔ ان کی ملازمت کی زندگی کے دوران صرف دو تین ایسے انسپکٹر آئے۔ جو ماسٹروں کے گھر سے دودھ کا گلاس پینا بھی حرام سمجھتے تھے۔ لیکن ماسٹر جی کو یہ گلہ تھا کہ ایسے نیک لوگوں کا جلد ہی ٹرانسفر کر دیا جاتا تھا۔

سلیم کا باپ اسے اسکول میں داخل کرنے کے لئے آیا تو اس نے جاتے وقت مصافحہ کرتے ہوئے دس روپے کا نوٹ ماسٹر جی کے ہاتھ میں تھما دیا۔

ماسٹر جی نے کہا۔ "نہیں نہیں چوہدری صاحب آپ کی بڑی مہربانی لیکن،،،،

علی اکبر نے انہیں اپنا فقرہ پورا کرنے کا موقع نہ دیا اور کہا ماسٹر جی استاد کا حق کوئی نہیں دے سکتا۔ آپ دعا کریں خدا سلیم کو آپ کی خدمت کے قابل بنائے۔"



یہ گاؤں جس میں پرائمری سکول تھا۔ سلیم کے گاؤں سے ایک میل کے فاصلے پر تھا۔ اردگرد کے پانچ، چھ دیہات کے لڑکے یہاں تعلیم پاتے تھے۔ اور ان کی مجموعی تعداد ساٹھ کے لگ بھگ تھی۔ مجید اگرچہ دوسری جماعت میں تھا۔ لیکن وہ تین سال

سے سکول میں داخل تھا۔ عمر کے لحاظ سے صرف چھ سات لڑکے اس سے عمر میں بڑے تھے۔ لیکن داؤد کے سوا سب لڑکے اس سے خوف کھاتے تھے۔ داؤد دوسرے گاؤں کے تیلی کا لڑکا تھا۔ اور اس کے باپ نے اسے اسوقت تعلیم دینے کی ضرورت محسوس کی تھی۔ جب وہ دس برس کا ہو چکا تھا۔ اب وہ چوتھی جماعت میں تھا۔ اور ماسٹر کی غیر حاضری میں سب بچوں پر تھانے داری کرتا تھا۔ عمر کے علاوہ قد و قامت میں بھی وہ سب بچوں پر فوقیت رکھتا تھا۔ چہرے کے مقابلے میں اس کا سر قدرے چھوٹا نظر آتا تھا۔ شاید اسے اس لیے قینچی کی بجائے نائی کا استرا زیادہ پسند تھا۔ منڈے ہوئے سر پر تیل پالش کا کام دیتا تھا۔ اس کی چھوٹی سے پگڑی اکثر اس کے سر سے کھسک جایا کرتی تھی۔ اگر کوئی اور لڑکا اس طرح سر منڈا کر آتا تو اس کی شامت آجاتی تھی۔ لیکن کسی میں یہ جرات نہ تھی کہ وہ داؤد کے سر کو چھو سکے۔ یہ وہ بلند مقام تھا جہاں صرف ماسٹر صاحب کا ہاتھ پہنچ سکتا تھا۔

داؤد جتنا بڑا تھا۔ اسی قدر کند ذہن بھی تھا۔ چوتھی جماعت میں دو بار فیل ہو چکا تھا۔ لیکن ماسٹر جی کا خوش کرنے کے لئے وہ گاؤں سے ان کے لئے اپلے لاتا، ان کے گھر میں پانی بھرتا۔ ان کا حقہ تازہ کرتا اور کبھی کبھی ان کی گائے کے لئے چارہ بھی لے آتا تھا۔ یہ سکول اردگرد کے دیہات کے لئے پوسٹ آفس کا کام بھی دیتا تھا۔ ہر گاؤں کی ڈاک وہاں کے بچوں میں تقسیم کر دی جاتی تھی۔ ماسٹر جی نے چٹھیوں پر مہریں لگانے، ڈاک کی تھیلیاں کھولنے اور بند کرنے کا کام داؤد کے سپرد کر رکھا تھا۔ وہ ہر لحاظ سے سکول میں ماسٹر جی کا نائب تھا۔ لیکن سکول میں صرف دو لڑکے ایسے

تھے، جن کے معاملات میں وہ دخل دینے سے پرہیز کرتا تھا۔ یہ مجید اور موہن سنگھ تھے۔ مجید پہلا لڑکا تھا، جس نے داؤد کے خلاف بغاوت کا جھنڈا بلند کیا تھا۔

ایک دن دوپہر کے وقت ماسٹر جی گھر گئے ہوئے تھے۔ اور داؤد لڑکوں کو ڈانٹ ڈپٹ کرنے کے بعد دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے اونگھ رہا تھا۔ اس کی پگڑی سر سے کھسک کر اس کی گود میں پڑی تھی۔ لڑکے اپنی پگڑیوں کے کوڑے بنا کر کھیلنے لگے۔ مجید اس دن ٹوپی پہن کر آیا تھا۔ اس نے چپکے سے داؤد کی پگڑی اٹھا لی اور کوڑا بنا کر بچوں کے ساتھ کھیل میں شریک ہو گیا۔

جب داؤد کی آنکھ کھلی تو تمام لڑکے دبک کر اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ لیکن مجید کو سکول میں داخل ہوئے صرف ایک ہفتہ ہوا تھا۔ اور مدرسے میں اسے داؤد کے اختیارات کا صحیح اندازہ نہ تھا۔ تھوڑی دیر بے پرواہی سے ادھر ادھر دیکھنے کے بعد اس نے کوڑا داؤد کی طرف پھینک دیا اور کہا "یہ لو اپنی پگڑی"

میری پگڑی؟۔ داؤد یہ کہتے ہوئے اٹھا اور کوڑا اٹھا کر مجید کو مارنے لگا۔ چند کوڑے کھانے کے بعد مجید نے اس کا دوسرا سرا مضبوطی سے پکڑ لیا۔ داؤد نے دو تین معمولی جھٹکوں کے بعد اپنے مدمقابل کی طاقت کا اندازہ لگاتے ہوئے پوری قوت کے ساتھ کوڑا کھینچا، مجید نے اچانک کوڑا چھوڑ دیا۔ داؤد اپنا توازن قائم نہ رکھ سکا۔ اس کی ٹانگیں ایک لڑکے کے ساتھ ٹکرائیں اور وہ پیٹھ کے بل گر پڑا۔ لیکن پھر جلد ہی غضب ناک ہو کر اٹھا اور اپنی پوری طاقت سے مجید پر جھپٹ پڑا۔ اب دونوں کی کشتی دیکھنے کے قابل تھی۔ مجید اس کی کمر کے ساتھ چمٹا ہوا تھا۔ اور داؤد اس

کی پیٹھ پر مکے مار رہا تھا۔ مجید نے اچانک اسے اپنی ٹانگ سے اڑنگا دے کر فرش پر گرا دیا۔ اب وہ نیچے تھا اور مجید اوپر لیکن تھوڑی دیر بعد پھر داؤد کا پلہ بھاری تھا۔ مجید کا کرتا پھٹ چکا تھا۔ اس کے گال مکوں اور طمانچوں سے سرخ ہو چکے تھے۔ اور وہ بری طرح ہانپ رہا تھا۔ لیکن پھر بھی وہ ہار ماننے کے لئے تیار نہ تھا۔ وہ مار کھاتا، گرتا، اور پھر اپنے مد مقابل کے ساتھ گتھم گتھا ہو جاتا۔ داؤد کا غصہ اب پریشانی میں تبدیل ہوتا جا رہا تھا۔ کیونکہ اس وقت اس کے سامنے اپنے وقار کو بچانے یا مد مقابل پر اپنی جسمانی برتری ثابت کرنے کا مسئلہ نہ تھا۔ بلکہ سوال یہ تھا کہ لڑائی کس طرح ختم کی جائے۔ وہ اب مجید کو مارنے یا گرانے کی بجائے اپنے سے دور رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔! دیکھو اب بیٹھ جاؤ۔ ورنہ بہت ماروں گا۔ میں تمہارا لحاظ کر رہا ہوں تم نے میری پگڑی کا کوڑا کیوں بنایا تھا؟ ۔، تم باز نہیں آتے، دیکھو ابھی ماسٹر صاحب آ جائیں گے۔ داؤد بار بار یہ الفاظ دہرا رہا تھا۔ لیکن مجید اس کی کوئی بات سننے کے لئے تیار نہ تھا۔

بالآخر داؤد نے اسے زور سے دھکا دے کر گرا دیا۔ اور چند قدم پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ مجید کے سر اور پیٹھ پر کافی چوٹ آئی، لیکن وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ داؤد اب چند قدم دور کھڑا کہہ رہا تھا۔ ''اب آرام سے بیٹھ جاؤ، اب میں تمہارا لحاظ نہیں کروں گا۔

مجید نے ایک لمحہ کے لئے ادھر ادھر دیکھنے کے بعد ایک تختی اٹھائی اور آگے بڑھتے ہوئے کہا، اب کہاں جاؤ گے۔

داؤد نے اپنے ہاتھوں پر اس کا وار روکنیکی کوشش کی، لیکن تختی کا کنارہ اس کی

کلائی پر لگا۔ داؤد اس کے دوسرے وار کی زد سے بچنے کے لئے پیچھے ہٹا، لیکن مجید نے نیچے جھک کر اس کے گھٹنوں اور ٹخنوں پر دو تین وار کیے۔ وہ کبھی ایک اور کبھی دوسری ٹانگ پر ناچ رہا تھا۔ اس نے دوبارہ تختی چھننا چاہی، لیکن پھر چوٹ کھا کر پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے بھاگ کر دوسری تختی اٹھانے کی کوشش کی لیکن ابھی وہ جھکا ہی تھا کہ مجید نے اس کی کمر پر اتنے زور سے تختی ماری کہ وہ بلبلا اٹھا۔ داؤد میدان چھوڑ کر بھاگ رہا تھا۔ لیکن مجید اس کا پیچھا چھوڑنے پر تیار نہ تھا۔

اب قریباً تمام لڑکے مجید کی حمایت پر تھے۔ داؤد کی ہوا اکھڑ چکی تھی اور وہ بد حواس ہو کر مجید کے آگے آگے سکول کی چار دیواری کے اندر بھاگ رہا تھا۔

ادھر لڑکوں نے آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا۔ اتنے میں باہر کے دروازے پر کسی لڑکے نے آواز دی ”، ماسٹر جی آگئے۔ لڑکے بھاگ کر اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ مجید ماسٹر جی کو دیکھ کر آخری ضرب لگاتے لگاتے رک گیا۔

، ماسٹر جی نے آتے ہی گرج کر کہا۔ مجھے گھر میں تمہارا شور سنائی دے رہا تھا۔ داؤد تم انہیں چپ نہیں کراتے میں نے تمہیں مانیٹر کس لیے بنایا تھا۔

پیشتر اس کے کہ داؤد کوئی جواب دیتا، ماسٹر جی کی نگاہ مجید پر پڑی اور انھوں نے دوسرا سوال کر دیا کہ اس کا کرتا کس نے پھاڑا ہے۔

مجید اس سوال کے جواب میں خاموش رہا۔

، ماسٹر جی نے جھلا کر کہا میں پوچھتا ہوں اس کا کرتا کس نے پھاڑا ہے۔ اور اس کے گال بھی سرخ ہیں۔ اسے کس نے مارا ہے۔ بتاتے کیوں نہیں؟۔

ایک لڑکے نے ہمت کر کے کہا، ماسٹر جی مجید اور داؤد آپس میں لڑ رہے تھے۔"

، ماسٹر جی نے کچھ اور پوچھے بغیر دو، تین چھڑیاں داؤد کے رسید کر دیں "تیلی کے بچے تجھے بچوں کے ساتھ لڑتے شرم نہیں آتی۔؟"

ماسٹر جی کی غلط فہمی نے داؤد کو دنیا کا مظلوم ترین آدمی بنا دیا تھا۔ اس نے سسکیاں بھرتے ہوئے کہا "، ماسٹر جی ان لڑکوں سے پوچھیے، میں نے اس کا بہت لحاظ کیا ہے۔لیکن اس نے مجھے تختی سے مارا ہے۔"

تمہیں مجید نے مارا ہے؟۔

داؤد نے اپنے ہونٹ بھینچتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا اور اپنے پاجامے کے پائنچے اوپر اٹھا کر پنڈلیوں پر ضربوں کے نشان دکھائے۔

، ماسٹر جی نے کہا آخر تیلی نکلے نا۔

مجید نے کہا، ماسٹر جی میں نے اس کا لحاظ کیا ہے۔

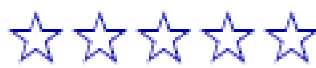
داؤد کے زخم مجید کی قمیض کی تلافی کرنے کے لئے کافی تھے۔، ماسٹر جی نے دونوں کو ڈانٹ ڈپٹ کر چھوڑ دیا۔

اس کے بعد داؤد اور مجید ایک دوسرے کے دوست بن چکے تھے۔

سکول میں دوسرا لڑکا جس سے مجید مرعوب ہو چکا تھا، موہن سنگھ تھا۔ موہن سنگھ کا باپ نہ صرف اس گاؤں کا زمین دار تھا۔ بلکہ اردگرد کے بہت سے دیہاتوں میں بھی اس کی زمینیں تھیں۔ گاؤں میں اس کا قلعہ نما مکان تھا۔ موہن سنگھ آٹھ سال کی عمر میں بھی نوکر کے کندھے پر سوار ہو کر سکول آتا تھا۔ وہ گاؤں کے ہر لڑکے کو گالیاں

دینا اپنا پیدائشی حق سمجھتا تھا۔ چنانچہ ایک دن اس نے داؤد کو بھی گالی دی۔ داؤد نے موہن سنگھ کو چپت رسید کی۔ ماسٹر جی کہیں گئے ہوئے تھے۔ موہن سنگھ روتا ہوا گھر پہنچا اور اپنے باپ کے دو نوکر ساتھ لے آیا۔ وہ داؤد کو پکڑ کر سکول سے باہر لے گئے اور بری طرح پیٹا۔

داؤد کا باپ سردار جی کے پاس شکایت لے کر گیا کہ آپ کے نوکروں نے میرے بیٹے کو پیٹا ہے۔ سردار صاحب اس وقت نشے میں تھے، ان کے لئے صرف یہ جاننا کافی تھا کہ یہ شخص داؤد کا باپ ہے۔ اور داؤد نے ان کے فرزند ارجمند کو گالی کا جواب تھپڑ سے دیا تھا۔ چنانچہ اس نے نوکروں کو حکم دیا کہ جوتوں سے اس کی مرمت کرو۔ اس کے بعد داؤد کو زندگی کی ان مجبوریوں کا احساس ہوا، جو ہر شخص کو گالی کا جواب تھپڑ سے دینے کی اجازت نہیں دیتیں۔



چند دنوں میں سلیم سکول کے ماحول سے مانوس ہو گیا۔ اس کے لئے یہ بات اطمینان کا باعث تھی کہ ماسٹر جی بچوں کو بلاوجہ نہیں مارتے تھے۔ بلکہ وہ شور مچانے، سبق یاد نہ کرنے والے اور غیر حاضر رہنے والے بچوں کو مارتے تھے۔ اور سزا دیتے تھے۔

اسکول سے باہر زندگی کی ہزاروں دلچسپیاں تھیں۔ جو ماسٹر جی کی مار پیٹ کے باوجود بہت سے لڑکوں کو غیر حاضر رہنے پر آمادہ کر دیتی تھیں۔ اسکول سے باہر

سرسبز کھیت اور باغات تھے۔ کھلی فضا میں پرندوں کے غول اڑتے تھے۔ جھلیں تھیں، جن میں کنول کھلتے تھے۔ وہ ندیاں اور نالے تھے، جن میں برسات کا پانی بہتا تھا۔ اسکول سے باہر فلک بوس پہاڑ دکھائی دیتے تھے۔ اور سب سے زیادہ اسکول سے باہر ہنسنے، کھیلنے اور بولنے کی آزادی تھی۔ اور اس کے مقابلے میں اسکول کی ایک محدود چار دیواری تھی۔ جس کے اندر دو کمرے تھے، ان کے آگے برامدہ تھا۔ کمرے کے ایک کونے میں ایک چھوٹا سا گڑھا تھا۔ جس کے غلیظ پانی میں لڑکے تختیاں دھویا کرتے تھے۔ سکول میں لکھنے کے لئے قلمیں، دواتیں اور تختیاں تھیں۔ پڑھنے کے لئے کتابیں تھیں۔

سلیم چھت کی کڑیوں سے لے کر اسکول کی ہر چیز کا معائنہ کر چکا تھا۔ دیوار پر چند بوسیدہ نقشے اور پرانی تصویریں تھیں۔ اور یہ سب سلیم کے دل پر نقش ہو چکی تھیں۔ وہ بیٹھنے کی چٹائیوں پر سیاہی کے دھبوں کے نشان اور چھت پر مکڑی کے جالے گن چکا تھا۔ دو تین ہفتوں کے بعد اسکول کی کوئی چیز ایسی نہ تھی جو اس کی توجہ جذب کر سکتی۔ اب اسکول اس کے لئے ایک نئی دنیا نہ تھا۔ بلکہ ایک چھوٹا سا قید خانہ تھا۔

جس کمرے میں وہ بیٹھا کرتا تھا۔ اس کی ایک کھڑکی شمال کو کھلتی تھی۔ وہ اس کھڑکی کے قریب بیٹھ جاتا۔ جہاں اسے باہر کے ہرے بھرے کھیت دکھائی دیتے تھے۔ اور دور افق پر کانگڑہ کے پہاڑ دکھائی دیتے تھے۔ جنہیں قریب جا کر دیکھنا اس کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش تھی۔ یہ کھڑکی وہ چھوٹی سی گزرگاہ تھی

جس کے راستے وہ اس تنگ ماحول سے فرار ہو کر سپنوں کی حسین دنیا میں پہنچ جاتا وہ پہاڑ کی گود میں سونے والے بادلوں کو نیند سے جگاتا اور ان پر سوار ہو کر آسمان کی نیلگوں فضاؤں میں اڑتا۔ اچانک ماسٹر جی کی آواز سنائی دیتی ''سلیم! تم کیا دیکھ رہے ہو؟'' اور اس کی رنگین دنیا درہم برہم ہو جاتی۔ وہ چونک کر کہتا ''جی کچھ نہیں''

''سبق یاد کیا تم نے؟''

''جی ہاں!''

''اچھا تختی لکھو!''

سبق یاد کرنا اور تختی لکھنا اس کے لیے معمولی بات تھی لیکن دن کے چھ سات گھنٹے اس تنگ ماحول میں سر جھکا کر بیٹھنا اس کے لیے ایک بہت بڑی سزا تھی۔



سلیم عام بچوں سے بہت زیادہ ذہین تھا۔ چھ ماہ میں اس نے پہلی جماعت پاس کر لی اور ماسٹر جی نے اسے دوسری جماعت کے بچوں کے ساتھ بٹھا دیا۔ ابتدا میں اس نے مجید کی ترغیب پر چند دن غیر حاضر رہنے کی کوشش کی لیکن ماسٹر جی بڑی جماعت کے لڑکوں کو ان کے گاؤں بھیج دیا کرتے تھے اور گھر کے آدمی انہیں کسی کھیت یا باغ سے تلاش کر کے اسکول میں چھوڑ آیا کرتے تھے۔ تلاش کے بعد سلیم کو چھوٹا سمجھ کر معمولی ڈانٹ ڈپٹ کے بعد معاف کر دیا جاتا لیکن مجید کی خوب مرمت کی جاتی۔ مجید کا باپ انہیں ماسٹر جی کے سپرد کرتے ہوئے کہتا ''ماسٹر جی سلیم ابھی

بچہ ہے، یہ سارا قصور مجید کا ہے۔''

غیر حاضر رہنے کی چند ناکام کوششوں کے بعد سلیم نے مجید کے مشوروں پر عمل کرنا ترک کر دیا۔ جس دن مجید کی نیت بگڑتی وہ گاؤں کے دوسرے لڑکوں کے ساتھ چل پڑتا۔ سلیم کے داخل ہونے سے پہلے گاؤں کے دوسرے لڑکوں پر مجید کی حکومت تھی، جب اس کی نیت خراب ہوتی تھی تو وہ ان سب کو روک لیا کرتا تھا، وہ بڑ آسانی سے ان کے دلوں میں نہر یا جھیل میں نہانے کا شوق پیدا کر دیا کرتا تھا اور جب وہ اس کا ساتھ دینے سے پس وپیش کرتے تو وہ انہیں مار پیٹ کر اپنی قیادت تسلیم کروالیا کرتا تھا۔ لیکن جب سلیم نے یہ تہیہ کر لیا کہ وہ غیر حاضر نہیں رہے گا تو مجید نے محسوس کیا کہ وہ ایک نئی صورتحال کا سامنا کر رہا ہے۔ سلیم کو ورغلانے میں اس کی کوئی تدبیر کامیاب نہ ہوتی۔ پہلے دن جب سلیم نے اس سے کہا ''اچھا تم نہ جاؤ میں تو ضرور جاؤں گا'' تو مجید نے اسے راستے میں دھوبی کے کتے سے ڈرانے کی کوشش کی سلیم اس پر بھی متاثر نہ ہوا تو مجید نے اسے مور کے انڈے دکھانے کا لالچ دیا لیکن سلیم اس لالچ میں بھی نہ آیا۔

جب مجید نے یہ دیکھا کہ وہ کسی صورت میں بھی اپنا ارادہ تبدیل نہیں کرتا تو اس نے دوسرے لڑکوں کو روکنے کی کوشش کی لیکن اس نے محسوس کے کہ وہ سلیم کو اپنا لیڈر بنا چکے ہیں، غصے میں آ کر اس نے ایک لڑکے کو مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا لیکن سلیم اس کے آگے کھڑا ہو گیا:

''دیکھو مجید! اگر تم نے کسی کو مارا تو میں تم سے لڑوں گا تم نے دادا جان کے ساتھ

وعدہ کیا تھا کہ آئندہ تم غیر حاضر نہیں رہو گے۔''

''تم مجھ سے لڑو گے؟'' مجید نے یہ کہہ کر اس کے منہ پر ہلکا سا چپت رسید کر دیا سلیم چند لمحے اپنی جگہ پر کھڑا اس کی طرف دیکھتا رہا۔ یہ پہلا چپت تھا جو اس نے مجید کے ہاتھ سے کھایا تھا لیکن اس کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ اس کے ہونٹ بھنچے ہوئے تھے اور اس کی نگاہیں مجید کے چہرے پر مرکوز تھیں سلیم اچانک مڑا اور کسی سے بات کیے بغیر اسکول کی طرف چل دیا۔ گاؤں کے دوسرے لڑکے جلال، بشیر، رام لال اور گلاب سنگھ اس کے پیچھے چل دیے۔

مجید کچھ دیر بے حس وحرکت کھڑا رہا، اس کا غصہ ندامت میں تبدیل ہو چکا تھا۔ یہ اس کی اور سلیم کی پہلی لڑائی تھی۔ اس نے سلیم کو گاؤں کے دوسرے لڑکوں سے لڑتے ہوئے دیکھا تھا اور وہ جانتا تھا کہ وہ ہار ماننے والوں میں سے نہیں جلال نے ایک دفعہ اسے گالی دی تھی اور اس نے اپنی تختی سے اس کا سر پھوڑ دیا تھا۔ لیکن اس کا یہ طرزِ عمل مجید کے لیے ایک معما تھا۔ اسے ان ہاتھوں سے شکایت تھی جو اس کی چپت کے جواب میں اس کا گریبان پھاڑنے کے لیے نہ اٹھے۔ اسے ان آنکھوں سے گلہ تھا جن میں غصے یا نفرت سے زیادہ مروت تھی۔

سلیم اور اس کے ساتھی تین چار کھیت آگے جا چکے تھے مجید ''سلیم! سلیم!'' کہتا ہوا ان کے پیچھے بھاگا۔ سلیم کے ساتھی اس کی طرف مڑ مڑ کر دیکھ رہے تھے لیکن سلیم نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ دی مجید کا خیال تھا کہ وہ اس کی آواز سن کر بھاگ نکلے گا۔ سکول پہنچنے سے پہلے وہ اسے پکڑ لے گا اور پھر دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑیں گے

لیکن سلیم اپنی معمولی رفتار سے چلتا رہا۔

اس نے قریب پہنچ کر پھر آواز دی ''سلیم! ٹھہرو! میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں''

سلیم نے اس کی طرف مڑ کر دیکھا اور کہا ''تم میرے ڈر سے اسکول مت جاؤ، میں دادا جان اور چچا جان سے تمہاری شکایت نہیں کروں گا۔''

سلیم آگے چل پڑا مجید مایوسی اور پریشانی کی حالت میں سر جھکائے اس کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ سارا راستہ وہ سلیم کو منانے کی مختلف ترکیبیں سوچتا رہا۔ اسکول کے قریب پہنچ کر اس نے کہا ''سلیم! تم مجھ سے صلح نہیں کرو گے؟''

سلیم نے جواب دینے کی بجائے اپنی رفتار تیز کر دی مجید نے کہا:

''اچھا یونہی سہی میں چھٹی کے دن تمہارے ساتھ نہر پر نہیں جاؤں گا!''

سلیم نے اس پر بھی کوئی جواب نہ دیا مجید نے پھر کہا ''میں چھٹی کے بعد واپس آ کر مور کے انڈے توڑ ڈالوں گا، میں تمہارے بگلے کے بچے بھی مار ڈالوں گا میں ان کے گلے میں رسی ڈال کر درخت سے لٹکا دوں گا۔''

سلیم کی رفتار سست ہو گئی اور وہ مڑ مڑ کر مجید کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ مجید کی باتوں کو مذاق نہیں سمجھتا۔

مجید نے کہا ''اور میں تمہاری بلی کے بچوں کو اٹھا کر درخت کی چوٹی پر رکھ آؤں گا کنوئیں کے پاس جامن کے سب سے اونچے درخت کی چوٹی پر پھر تم انہیں اتار نہیں سکو گے۔''

سلیم کی قوت برداشت جواب دے چکی تھی وہ اچانک اپنا بستہ اور تختی ایک

طرف پھینک کر زمین پر بیٹھ گیا اور منہ بسورنے لگا۔

مجید اور باقی لڑکے اس کے اردگرد کھڑے ہو گئے۔ جلال نے کہا ''چلو سلیم اب دیر ہو رہی ہے!''

سلیم نے زمین سے گھاس کے تنکے نوچتے ہوئے کہا ''میں نہیں جاؤں گا''

مجید ہنستا ہوا اس کے سامنے بیٹھ گیا اور اس کا منہ چڑانے لگا۔ سلیم اچانک غضب ناک ہو کر اٹھا اور مجید پر پل پڑا۔ کچھ دیر سلیم کو مکے مارنے اور بال نوچنے کا موقع دینے کے بعد مجید اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اس نے سلیم کی دونوں کلائیاں اپنے مضبوط ہاتھوں میں پکڑ لیں سلیم کا چہرہ غصے سے تمتما رہا تھا وہ مجید کو ٹھڈے مار رہا تھا لیکن مجید ہنس رہا تھا۔

جلال نے آگے بڑھ کر انہیں چھڑانے کی کوشش کی لیکن مجید نے اسے دھکا دے کر پیچھے گراتے ہوئے کہا ''تم دور رہو، سلیم کو اپنا غصہ نکال لینے دو'' سلیم موقع ملتے ہی کھیت سے مٹی کے ڈھیلے اٹھا کر اسے مارنے لگا۔ مجید ادھر ادھر بھاگ کر اپنے آپ کو بچاتا رہا۔ ایک ڈھیلا مجید کے سر پر لگا اور وہ اپنا سر پکڑ کر رہ گیا۔ سلیم ایک اور ڈھیلا اٹھا کر قدرے تذبذب کی حالت میں اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مجید آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھا۔ سلیم نے اپنا ہاتھ بلند کیا لیکن وہ ادھر ادھر بھاگنے کی بجائے ڈٹ کر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا ''مارتے کیوں نہیں؟'' اس نے کہا سلیم نے ڈھیلا زمین پر پھینک دیا۔

مجید نے زمین سے سلیم کی ٹوپی اٹھا کر اس کے سر پر رکھ دی۔ پھر دونوں نے

اپنے اپنے بستے اٹھا لیے اور خاموشی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ مجید مسکرا رہا تھا اور سلیم اپنی مسکراہٹ چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجید نے کہا ''لاؤ میں تمہارے کپڑے جھاڑ دوں'' اور سلیم کھلکھلا کر ہنس پڑا وہ سب ہنس رہے تھے

جلال نے کہا ''سلیم! مجید بگلے اور بلی کے بچوں کو نہیں مارے گا یہ تمہیں یونہی ڈرا رہا تھا۔''

''میں جانتا ہوں'' سلیم نے بے پروائی سے جواب دیا

مجید نے کہا ''لیکن جلال کے بچے، تمہاری مرغی نے بچے نکالے ہیں اور میں انہیں نہیں چھوڑوں گا میں انہیں سلیم کی بلی کے آگے ڈال دوں گا وہ مرغی کے بچوں کو کھا لیتی ہے۔''

جلال کو اب سکول سے زیادہ اپنی مرغی کے بچوں کی فکر تھی وہ سوچ رہا تھا ''کاش میں ان کی باتوں میں دخل نہ دیتا!''

سلیم نے اسے مغموم دیکھ کر اس کے کان میں کہا ''جلال مجید تمہیں یونہی ڈرا رہا ہے''

جب یہ بچے اسکول میں داخل ہوئے تو داؤد گھنٹی بجا رہا تھا۔ اس نے مجید کو دیکھتے ہی کہا ''مجید میں نے آج ایک درخت پر طوطے کے بچے دیکھے ہیں، آج چھٹی کے بعد وہاں چلیں گے۔''

سلیم نے کہا ''میں بھی تمہارے ساتھ جاؤں گا''

داؤد نے کہا ''وہاں بہت سے بچے ہیں میں تمہیں بھی ایک دوں گا''

جلال نے کہا ''اور مجھے؟''

داؤد نے کہا ''میں تم سب کو ایک ایک بچہ اتار دوں گا لیکن بولنے والا طوطا میرا ہوگا!''

سلیم نے کہا ''بولنے والا کیسا ہوتا ہے؟''

''اس کے گلے میں دھاری ہوتی ہے؟''



تیسرے پہر اسکول میں چھٹی ہوئی اور داؤد کی رہنمائی میں لڑکے طوطے کے بچوں کی تلاش میں نکل پڑے۔ سلیم نے اسے ایک آنہ دیا اور جلال نے اسے ایک پیسے کی مونگ پھلی خرید دی تھی۔ گلاب سنگھ اور بشیر نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ کل اسے اپنے گھروں سے گڑ لا دیں گے اور داؤد اس کے عوض انہیں طوطے کا ایک ایک بچہ دینے کا وعدہ کر چکا تھا۔ مجید سے اس نے کوئی قیمت نہیں مانگی تھی تاہم وہ داؤد کے بعد دوسرا بہترین طوطا حاصل کرنے کے لیے اسے مور کا ایک انڈا دینے کا لالچ دے چکا تھا۔ دو لڑکے داؤد کے اپنے گاؤں کے تھے اور اس نے پہلے ہی ان سے شرائط طے کر رکھی تھیں۔

راستے میں مجید نے داؤد سے پوچھا ''اگر بچے تھوڑے ہوئے تو؟''

داؤد نے جواب دیا ''نہیں اس درخت پر کئی گھونسلے ہیں صرف چڑھنا ذرا مشکل ہے۔''

مجید نے کہا ''تم کہتے تھے کہ بولنے والا طوطا تم کسی کو نہیں دو گے؟''

داؤد نے جواب دیا ''اگر دو ہوئے تو میں ایک تمہیں دے دوں گا''

سلیم نے کہا ''اور مجھے نہیں دو گے؟''

''اگر زیادہ ہوئے تو تمہیں بھی دوں گا''

سلیم نے کہا ''داؤد! درخت پر چڑھ کر تمام گھونسلے اچھی طرح دیکھنا!''

داؤد نے جواب دیا ''دیکھوں گا لیکن وہ طوطے جن کے گلے میں دھاری ہوتے ہے، زیادہ نہیں ہوتے۔''

سلیم نے کہا ''دیکھو داؤد مجھے دھاری والا طوطا چاہیے میں کل تمہیں ایک آنہ اور لا دوں گا اور گڑ بھی لا دوں گا''

مجید کو یہ بات پسند نہ تھی کہ سلیم اس کی موجودگی میں کسی اور کی منت کرے اس نے کہا ''سلیم! اگر اس نے تمہیں دھاری والا طوطا نہ دیا تو میں خود درخت پر چڑھ کر تمہیں طوطا اتار دوں گا''

داؤد نے کہا ''میں شرط لگاتا ہوں تم اس درخت پر نہیں چڑھ سکتے اس کا تنا بہت موٹا ہے صرف ایک ٹہنی ہے جسے پکڑ کر اوپر چڑھا جا سکتا ہے لیکن تم میں سے کسی کے ہاتھ وہاں تک نہیں پہنچ سکتے۔ اس ٹہنی کو پکڑنے کے لیے مجھے بھی تمہارا سہارا لینا پڑے گا۔''

مجید نے کہا ''سلیم! اگر تمہیں دھاری والا طوطا نہ ملا تو میں تمہیں اپنا طوطا دے دوں گا میں دوسرا لے لوں گا۔''

پیپل کے درخت کے نیچے پہنچ کر لڑکوں نے اپنے بستے زمین پر رکھ دیے مجید اور جلال نے داؤد کو سہارا دینے کے لیے ایک دوسرے کی کلائیاں پکڑ لیں۔ ایک لڑکا ان کے قریب زمین پر ہاتھ ٹیک کر بیٹھ گیا۔ داؤد نے ایک پاؤں اس کی پیٹھ پر رکھا اور دوسرا پاؤں مجید اور جلال کی کلائیوں پر رکھ دیا۔ پھر اس نے دونوں پاؤں ان کی کلائیوں پر رکھ دیے۔ بوجھ سے جلال کی کمر جھک رہی تھی لیکن مجید نے اس کی کلائیاں پکڑ رکھی تھیں۔

جلال کہہ رہا تھا ''داؤد جلدی کرو!''

داؤد نے مجید اور جلال کے سروں پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہونے کی کوشش کی۔ لیکن ابھی اس نے درخت کی شاخ پر ہاتھ نہیں ڈالے تھے کہ جلال اپنی جگہ سے ہل گیا۔

''جلال کے بچے تم۔۔۔۔'' داؤد اپنا فقرہ پورا نہ کر سکا اور پیٹھ کے بل گرا لیکن گرتے ہی اٹھ بیٹھا لڑکے بڑی مشکل سے اپنی ہنسی ضبط کر رہے تھے داؤد نے اپنی پگڑی جواب ڈھیلی ہو چکی تھی، اتار کر پھینک دی اور بھاگ کر دونوں ہاتھوں سے جلال کے کان پکڑ لیے۔

مجید نے جلدی سے آگے بڑھ کر جلال کو چھڑاتے ہوئے کہا ''داؤد یہ تمہارا قصور ہے، تمہیں اتنی دیر نہیں لگانی چاہیے تھی اب ہم پھر تمہیں سہارا دیتے ہیں اب کے زیادہ بوجھ مجھ پر رکھنا''

داؤد دوبارہ ہمت آزمائی کے لیے تیار ہو گیا تاہم اس نے کہا ''جلال کے بچے! اگر اب کی بار تم نے مجھے گرایا تو تمہیں طوطا نہیں ملے گا۔''

اس مرتبہ جلال میں ذمہ داری کا احساس نسبتاً زیادہ تھا داؤد کسی اوحادثہ کے بغیر درخت پر چڑھ گیا۔

درخت کا درمیانی تنا جس میں داؤد کے اندازے کے مطابق جا بجا طوطوں کے گھونسلے تھے، بہت موٹا تھا لیکن اس کی شاخیں چاروں طرف پھیلی ہوئی تھیں۔ داؤد ان شاخوں سے سیڑھیوں کا کام لے کر تنے کے گرد چکر لگاتا ہوا اوپر چڑھ رہا تھا۔

ایک سوراخ سے دو طوطے اڑے داؤد نے خوش ہو کر اندر ہاتھ ڈالا اور تھوڑی دیر تلاش کرنے کے بعد کہا ”اس کے اندر کچھ بھی نہیں، میرے خیال میں بچے بڑے ہو کر اڑ گئے ہیں“

لڑکوں کو مایوسی ہوئی سلیم نے کہا ”داؤد اوپر بہت سے سوراخ ہیں، ان میں بچے ضرور ہوں گے تم اچھی طرح دیکھو!“

مجید نے جواب دیا ”تم فکر نہ کرو“

ایک اور سوراخ سے طوطا اڑا اور داؤد اندر ہاتھ ڈال کر چلا اٹھا ”مل گئے! مل گئے!! دو! نہیں تین“ اس کے بعد تین بچے نکال کر ٹہنی پر رکھ دیے اور انہیں غور سے دیکھنے کے بعد کہا ”ان میں سے کسی کے گلے میں بھی دھاری نہیں اور یہ بہت چھوٹے ہیں ان کے پر ابھی اچھی طرح نہیں نکلے۔“

چند لڑکے انہیں حاصل کرنا ہی اپنے لیے کافی سمجھتے تھے لیکن سلیم نے نیچے سے آواز دی ”دیکھو! داؤد انہیں وہیں رہنے دو یہ بہت چھوٹے ہیں یہ مر جائیں گے۔“

داؤد نے تینوں بچے گھونسلے میں رکھ دیے اور کہا ”میں اور اوپر دیکھتا ہوں“

ایک اور گھونسلے سے داؤد کو دو بچے ملے لیکن اسے کسی کے گلے میں دھاری نظر نہ آئی تاہم یہ کافی بڑے تھے نیچے لڑکے اپنی جھولیاں تانے کھڑے تھے لیکن داؤد نے کہا ''میں واپسی پر انہیں اپنی جھولی میں ڈال لاؤں گا، ابھی اوپر اور گھونسلے ہیں''

چوٹی کے قریب پہنچ کر داؤد کو ایک اور گھونسلا دکھائی دیا اور وہ چلایا ''مجید اوپر دیکھو چوٹی پر کسی بڑے جانور کا گھونسلا ہے۔''

مجید نے تھوڑی دیر غور سے دیکھنے کے بعد کہا ''یار یہ بہت بڑا گھونسلا ہے کہیں چیل کا تو نہیں؟''

جلال نے کہا ''داؤد میری ماں کہتی تھی کہ چیل کے گھونسلے میں سونا ہوتا ہے''

مجید نے کہا ''تم بکتے ہو بھلا چیل سونا کہاں سے لاتی ہے۔''

جلال نے کہا ''سچ کہتا ہوں مجید! ماں کہتی تھی کہ چیل کے گھونسلے میں سونا ہوتا ہے''

مجید نے کہا ''اگر نہ ہوا تو؟''

جلال کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہ تھا لیکن سلیم نے کہا ''ہاں مجید! جلال جھوٹ نہیں کہتا چیل کے گھونسلے میں سونا ہوتا ہے تمہیں وہ کہانی یاد نہیں؟ ایک رانی نہا رہی تھی، اس نے اپنا ہار اتار کر مکان کی چھت پر رکھ دیا اور چیل اسے لے کر اڑ گئی۔ ایک آدمی جنگل میں لکڑیاں کاٹنے گیا تو اسے چیل کے گھونسلے سے سونے کا ہار مل گیا۔ وہ ہار اٹھا کر راجہ کے پاس لے گیا اور راجہ نے اسے بہت سا انعام دیا۔''

جلال نے کہا ''دیکھا میں نہیں کہتا تھا کہ چیل کے گھونسلے میں سونا ہوتا ہے''

مجید نے داؤد کو آواز دی "دیکھو داؤد شاید تمہیں بھی ہار مل جائے"

لیکن داؤد سلیم کی کہانی سن چکا تھا اسے اب کسی مشورے کی ضرورت نہ تھی وہ تیزی سے چوٹی کی طرف چڑھ رہا تھا اب اس کی نگاہ میں دھاری والے طوطے کی کوئی اہمیت نہ تھی۔۔۔۔داؤد سونے کے ہار کے لیے ہر خطرہ مول لینے کے لیے تیار تھا لیکن جونہی اس نے گھونسلے کے قریب پہنچ کر ہاتھ بلند کیا، گھونسلے میں پھڑ پھڑاہٹ کی آواز پیدا ہوئی اور ایک چیل اس کے سر پر جھپٹا مار کر ایک طرف اڑ گئی۔داؤد نے زندگی میں پہلی بار سر کے بالوں کی ضرورت محسوس کی۔وہ ابھی اپنے سر پر ہاتھ پھیر رہا تھا کہ چیل نے دوسری بار فضا میں غوطہ لگایا اور اس کے سر میں پنجے گاڑ کر بیٹھ گئی داؤد نے زور سے ہاتھ مار کر اسے پھر ایک بار اڑا دیا اور تیزی سے نیچے اترنے لگا لیکن چیل اس پر بار بار جھپٹ رہی تھی تھوڑی دیر میں داؤد چوٹی کی پتلی اور خطرناک ٹہنیوں سے اتر کر قدرے مضبوط شاخوں پر پاؤں رکھ چکا تھا لیکن اتنی دیر میں مادہ چیل کی چیخیں سن کر نر بھی اس کی مدد کے لیے پہنچ چکا تھا اور وہ دونوں یکے بعد دیگرے اس پر جھپٹ رہے تھے اور ان کے ٹھونگوں اور پنجوں کا ہدف داؤد کی استرے سے منڈی ہوئی چمکدار کھوپڑی تھی نیچے اس کے ساتھی قہقہے لگا رہے تھے اور وہ اوپر سے چلا رہا تھا "جلال کے بچے تمہاری ماں نے چیل کے گھونسلے میں سونا۔۔۔۔"

چیل نے اس کے سر پر جھپٹا مارا اور وہ اپنا فقرہ پورا نہ کر سکا۔

مجید بار بار کہتا "آئی، آئی! چیل آئی!!"

اور داؤد اپنے ایک ہاتھ سے ٹہنی پکڑ کر دوسرے ہاتھ اور بازو کو اپنے سر اور

آنکھوں کے لیے ڈھال بنالیتا۔پھر وہ تیزی سے چند قدم نیچے آجاتا مجید پھر چلایا''
اب دوسری آئی!''

داؤد نے گرتے، سنبھلتے، چیختے، چلاتے درخت کی نچلی ٹہنی پر پہنچ کر زمین پر چھلانگ لگادی۔اس کے سر میں چیلوں کے پنجوں اور ٹھونگوں کے نشان تھے اور کہیں کہیں سے خون بھی رس رہا تھا۔لڑکوں کے قہقہے اب بند ہو چکے تھے۔داؤد تھوڑی دیر بے حس وحرکت زمین پر بیٹھا اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھتا رہا۔بالآخر اس نے کہا'' جلال کے بچے تم بھی ہنستے تھے!''

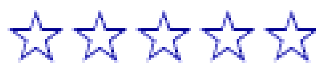
جواب نہ پا کر اس نے مڑ کر چاروں طرف دیکھا، جلال وہاں نہ تھا، رام لال نے ایک طرف ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا'' ارے جلال وہ جا رہا ہے!''

''کہاں؟'' داؤد نے اٹھتے ہوئے کہا

''وہ دیکھو!''

داؤد چلایا''ٹھہرو! جلال کے بچے!''

لیکن جلال بغل میں بستہ دبائے سرپٹ بھاگا چلا جا رہا تھا اور اس کی رفتار یہ ظاہر کر رہی تھی کہ وہ اپنے گاؤں میں پہنچے بغیر پیچھے مڑ کر نہیں دیکھے گا۔



برسات کا موسم شروع ہو چکا تھا۔لڑکے مدرسے کے صحن میں کھڑے اوپر بادلوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔مغرب سے اٹھنے والی گھٹا کی رفتار کافی تیز تھی۔تاہم

بچوں کو یہ خدشہ تھا کہ اگر ماسٹر جی کی آمد سے پہلے بارش شروع نہ ہوگئی تو انہیں چھٹی نہیں ملے گی سیاہ رنگ کے بادل ابھی تک سورج سے کچھ دور تھے۔ گزشتہ شب کافی مینہ برس چکا تھا اور دن کے وقت بھی بارش کے آثار دیکھ کر دوسرے دیہات سے آنے والے بہت سے لڑکے غیر حاضر تھے۔

سلیم، مجید اور ان کے گاؤں کے دوسرے لڑکے اب شاذونادر ہی غیر حاضر رہا کرتے تھے۔ لیکن ایسے دنوں میں آم اور جامن کے درختوں کے نیچے یا جھیلوں اور برساتی ندیوں کے کنارے ان کے لیے دلچسپی کے ہزاروں سامان تھے جب رات کے وقت بارش ہو رہی تھی تو انہیں سو فیصدی یقین تھا کہ صبح انہیں سکول نہیں جانا پڑے گا اور وہ سارے دن کے لیے کھیلنے، کودنے، تیرنے اور نہانے کے پروگرام بنا چکے تھے۔ لیکن علی الصباح بارش تھم گئی اور مشرق کی طرف آسمان کے کونے پر بادلوں نے ادھر ادھر سمٹ کر سورج کے لیے جگہ خالی کر دی۔ انہیں مایوسی ہوئی تاہم جب وہ گاؤں سے نکلے تو جنوب مغرب کے کونے سے کالی گھٹا اٹھ رہی تھی وہ اس امید پر چلتے رہے کہ یہ گھٹا ان کے سکول پہنچنے سے پہلے برس پڑے گی اور وہ ہنستے، اچھلتے او رکودتے گھروں کو لوٹ آئیں گے۔ انہوں نے یہ فاصلہ کافی سست رفتار سے طے کیا لیکن بارش نہ ہوئی مدرسے کی چاردیواری کے قریب پہنچ کر مجید نے کہا "آج بہت کم لڑکے آئے ہوں گے، ابھی تک گھنٹی نہیں بجی، اگر آدھے لڑکے غیر حاضر ہوئے تو ماسٹر جی چھٹی دے دیں گے۔ اگر تھوڑی دیر گھنٹی نہیں بجی تو بارش شروع ہو جائے گی ماسٹر جی پھر بھی چھٹی دے دیں گے۔"

سکول پہنچ کر وہ باقی لڑکوں کی طرح بے قراری سے آسمان کی طرف دیکھ رہے تھے بادل اب آسمان کے مشرقی کونے میں پہنچ چکے تھے اور سورج چھپ چکا تھا۔ اودے اور کالے رنگ کے بادل ایک دوسرے میں گھل مل جانے کے بعد ایک دھندلے رنگ کے نقاب میں تبدیل ہو رہے تھے۔ سکول کی ایک طرف ایک جوہڑ میں مینڈکوں نے آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا اور دوسری طرف آم کے درخت پر پپیہا بول رہا تھا۔

داؤد ماسٹر جی کا حقہ اٹھائے اندر داخل ہوا اور لڑکوں کے چہروں پر مایوسی چھا گئی۔

داؤد نے اندر جا کر حقہ ماسٹر جی کے چبوترے پر رکھ دیا اور باہر نکل کر گھنٹی بجادی لڑکے قطاریں باندھ کر صحن میں کھڑے ہو گئے اور داؤد کے حکم سے ترانہ شروع ہوا

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری
زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری

لیکن کم سن بچوں کو یہ معلوم نہ تھا کہ شمع کی زندگی کیا ہوتی ہے؟ وہ صرف آسمان کی طرف دیکھ رہے تھے ان کے دلوں میں فقط ایک ہی تمنا تھی اور وہ یہ کہ بارش ہو جائے اور ماسٹر جی گھر سے اپنے حقے کا پیچھا نہ کریں۔

لیکن ماسٹر جی آ گئے وہ پٹواری کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہے تھے دونوں پھاٹک پر رک گئے وہ کسی اہم موضوع پر بحث کر رہے تھے اور عام حالات میں ان کی بحث بہت طویل ہوا کرتی تھی۔

باتیں کرتے کرتے پٹواری نے آسمان کی طرف دیکھا اور کہا ’ماسٹر جی یہ بادل

ضرور برسے گا رات بھی خوب بارش ہوئی ہے۔"

ماسٹر جی نے بھی آسمان کی طرف دیکھا اور پھر صحن میں لڑکوں کی طرف متوجہ ہو کر کہا "آج بہت سے لڑکے غیر حاضر ہیں۔"

دعا ختم ہوئی ماسٹر جی کے حکم سے داؤد اندر سے حاضری کا رجسٹر اٹھا لایا۔ عام حالات میں ماسٹر جی اپنے چبوترے پر بیٹھ کر حقے کے دو چار کش لگانے کے بعد حاضری لگایا کرتے تھے لیکن آج انہوں نے صحن میں کھڑے کھڑے حاضری لی پٹواری ان کے قریب کھڑا رہا مسٹر جی نے حاضری لیتے لیتے آسمان کی طرف دیکھا ایک دو بوندیں ان کے رجسٹر پر گریں اور انہوں نے جلدی سے حاضری ختم کر کے رجسٹر داؤد کے ہاتھ میں دے دیا۔

پٹواری نے کہا "ماسٹر جی آج چھٹی کریں"

ماسٹر جی نے جواب دینے کی بجائے آسمان کی طرف دیکھا۔ مجید نے سلیم کے بازو پر چٹکی لی اور اس نے ایک لڑکے کے پیچھے منہ چھپا کر بلند آواز میں کہا "چھٹی! چھٹی!!"

دوسرے کونے سے کسی اور لڑکے نے اس کی تقلید کی اور تمام لڑکے نعرے لگانے لگے چھٹی، چھٹی، چھٹی!

اگر ماسٹر جی کے دماغ پر موسم کے خوشگوار اثرات نہ ہوتے تو وہ شاید ڈنڈا اٹھا لیتے یا انہیں کان پکڑنے کا حکم صادر فرماتے لیکن ان کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی اور اس کے ساتھ ہی لڑکوں کے نعرے اور زیادہ بلند ہو گئے ماسٹر جی نے پٹواری کی

طرف دیکھا۔

پٹواری نے کہا "ماسٹر جی آج آم کھانے کا دن ہے۔"

ماسٹر جی نے پھر لڑکوں کی طرف دیکھا اور ہنستے ہوئے کہا "بہت نالائق ہو تم اچھا جاؤ! لیکن کل کوئی غیر حاضر نہ رہے۔"

☆☆☆☆☆

لڑکے سکول سے نکل کر گاؤں سے باہر ایک جوہڑ کے کنارے جمع ہو گئے۔ گدلے پانی کا یہ جوہڑ ایک چھوٹے سے برساتی نالے کے شفاف پانی سے بھر چکا تھا۔ تھوڑی دیر پانی میں تیرنے اور غوطے لگانے کے بعد لڑکوں نے کبڈی کھیلنی شروع کر دی۔ سکول والے گاؤں کے لڑکے تعداد میں زیادہ تھے اور باہر کے دیہات سے آنے والے لڑکوں کی تعداد تھوڑی تھی، اس لیے فریقین کی تعداد برابر کرنے کے لیے سکول والے گاؤں کے چند لڑکے باہر سے آنے والے لڑکوں کی طرف ہو گئے۔ داؤد اور مجید کو کھیل میں شریک کرنے سے تمام لڑکے گھبراتے تھے، اس لیے یہ فیصلہ ہوا کہ مجید ایک طرف ہو گا اور داؤد اس کے مخالف کھیلے گا اور وہ چھوٹے بچوں کو ہاتھ نہیں لگائیں گے۔ ایک طرف سے اگر مجید کبڈی کے لیے آئے گا تو اس کا مقابلہ صرف داؤد کے ساتھ ہو گا، اس طرح داؤد کا مقابلہ صرف مجید کرے گا۔ کھیت کے درمیان دو بستے رکھ کر لکیر کھینچ دی گئی لیکن کھیل شروع ہونے والا تھا کہ مجید کو جوہڑ کے کنارے خیر دین کے گدھے نظر آ گئے اور وہ داؤد کو اپنے ساتھ لے کر اس طرف

چل دیا۔

سلیم نے پوچھا ”کہاں جا رہے ہو مجید؟“

اس نے کہا ”تم کھیلو سلیم ہم ابھی آتے ہیں“

مجید کی غیر حاضری میں سلیم اپنی طرف کے کھلاڑیوں کا لیڈر تھا۔ دوسری طرف اس کا مد مقابل موہن سنگھ تھا۔ کبڈی کی ابتدا موہن سنگھ نے کی۔ وہ بڑے اطمینان سے اپنی مخالف ٹیم کے ایک لڑکے کو ہاتھ لگا کر چلا گیا۔ اس کے جواب میں سلیم کی طرف سے گلاب سنگھ کبڈی کے لیے نکلا اور ایک لڑکے کو پچھاڑ آیا۔ موہن سنگھ دوبارہ ایک لڑکے کو چھو گیا۔ پھر سلیم کی باری آئی اور وہ اپنے مد مقابل کو پچھاڑ کر توازن پورا کر آیا لیکن تھوڑی دیر میں سلیم نے محسوس کیا کہ جب موہن سنگھ کبڈی کے لیے آتا ہے تو اس کے اپنے گاؤں کے لڑکوں میں سے کوئی اسے پکڑنے کی جرأت نہیں کرتا۔ گلاب سنگھ نے سلیم کے کان میں کہا ”سلیم لڑکے موہن سنگھ سے ڈرتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ اگر انہوں نے مقابلہ کیا تو اس کے باپ کے نوکر انہیں ان کے گھروں میں جا کر پیٹ آئیں گے انہوں نے ہمارے آدھے ساتھیوں کو بٹھا دیا ہے، یہ جلال، رام لال اور بشیر بھی ڈرتے ہیں۔“

سلیم نے کہا ”اب جلال تم موہن سنگھ سے ڈرتے ہو؟“

اس نے جواب دیا ”جب میں کبڈی کے لیے جاتا ہوں تو وہ مجھے گالیاں دیتا ہے۔“

”اچھا اب کی بار میں اس کی خبر لوں گا؟“

سلیم کو یوں بھی اس سے نفرت تھی جب سے اس نے یہ سنا تھا کہ موہن سنگھ نے داؤد کو اپنے نوکروں سے پٹوایا تھا اور اپنے باپ سے داؤد کے باپ کی بے عزتی کروائی تھی وہ اسے بہت حقیر سمجھتا تھا۔

جب موہن سنگھ کبڈی کے لیے آیا تو سلیم آگے بڑھ کر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا موہن سنگھ نے پوری طاقت سے اس کے سینے پر ہاتھ مارا۔ اس کے جواب میں سلیم کا ہاتھ اس کی گردن پر لگا اس نے الٹے پاؤں پیچھے ہٹنے کی کوشش کی لیکن سلیم نے آگے بڑھ کر اس کے سینے پر دو ہتڑ ماری اور وہ پیٹھ کے بل گر پڑا موہن سنگھ نے گرتے ہی ''کبڈی کبڈی'' کی بجائے گالیوں کی گردان شروع کر دی یہ دونوں کے لیے نیا تجربہ تھا موہن سنگھ کے ساتھ کھیل کود میں کسی نے آج تک اپنی جسمانی قوت کا مظاہرہ کرنے کی جرأت نہیں کی تھی اور سلیم کو کسی نے گالی نہیں دی تھی۔ دونوں گتھم گتھا ہو چکے تھے۔ موہن سنگھ نیچے گر کر بھی گالیاں دے رہا تھا اور سلیم ہر گالی کے جواب میں اسے ایک مکا رسید کر دیتا تھا۔ ایسی حالت میں زمیندار کے صاحبزادے کی مدد کرنا اس کے گاؤں کے غریب لڑکوں کے لیے ایک مجبوری تھی۔ پانچ چھ لڑکے سلیم پر پل پڑے لیکن گلاب سنگھ اور بشیر بھاگ کر اپنی تختیاں اٹھا لیں۔ ان کی تعداد بیس کے لگ بھگ تھی باہر کے دیہات کے تین اور لڑکے سلیم، گلاب سنگھ، اور بشیر کے طرف دار بن گئے اور باقی غیر جانبدار ہو گئے۔ جلال حسب عادت اپنا بستہ اٹھا کر پوری رفتار سے اپنے گاؤں کا رخ کر رہا تھا۔

سلیم نے کھیت کی چکنی مٹی اٹھا کر موہن سنگھ کے منہ پر تھوپ دی اور اسے چھوڑ کر

اپنے ساتھیوں کی صف میں کھڑا ہو گیا۔

موہن سنگھ، سلیم کی گرفت سے آزاد ہوتے ہی اپنے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہوا ”دیکھو! اب یہ بھاگ نہ جائیں، انہیں گھیر لو!“

وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگے۔ اتنی دیر میں رام لال جوہڑ کے دوسرے کنارے پر پہنچ کر دہائی دے رہا تھا ”دادا! مجید! لڑائی ہو گئی! دوڑو، دوڑو! وہ گدھوں پر ڈنڈے برساتے چلے آرہے تھے اور خیر دین حسب معمول ان کے پیچھے تھا۔“

موہن سنگھ کے ساتھ اس کے حکم کے مطابق کھیت کے چاروں طرف گھیرا ڈال چکے تھے۔

سلیم اور اس کے ساتھی مشورہ کرنے کے بعد اچانک اس طرف ٹوٹ پڑے جدھر موہن سنگھ کھڑا تھا۔ گلاب سنگھ کی تختی ایک لڑکے کے بازو پر لگی اور وہ بلبلاتا ہوا اپنے گھر کی طرف بھاگ نکلا، بشیر نے دوسرے کے گھٹنے پر ضرب لگائی اور اس نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ باقی ادھر ادھر ہٹ گئے سلیم کا رخ موہن سنگھ کی طرف تھا، وہ اپنے ساتھیوں سے کٹ چکا تھا۔ اس نے بھاگ کر ان تک پہنچنے کی کوشش کی لیکن سلیم نے اس کا راستہ روک لیا۔ مجبوراً اس نے اپنے گھر کا رخ کیا۔ سلیم نے اس کی پیٹھ پر ایک تختی رسید کی اور اس کی رفتار تیز ہو گئی۔ دھوبی کے گھر تک سلیم نے اس کا پیچھا کیا لیکن جب دھوبی کا کتا گھر سے نکل کر بھونکتا ہوا موہن سنگھ کے پیچھے ہو لیا تو سلیم ہنستا ہوا واپس آ گیا۔

اتنی دیر میں مجید اور داؤد پہنچ چکے تھے اور موہن سنگھ کے باقی ساتھیوں کو کان پکڑنے کا حکم دے چکے تھے۔ سلیم نے کہا "داوے دان کا کوئی قصور نہیں انہوں نے ہمیں کچھ نہیں کہا یہ موہن سنگھ کے خوف سے ہمارے ساتھ لڑنے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔ انہیں ڈر تھا کہ موہن سنگھ اپنے نوکروں سے پٹوائے گا۔"

داؤد نے کاہ "اچھا چھوڑ دو کان"

ایک لڑکے نے کہا "سلیم! اب تم بھاگ جاؤ موہن سنگھ تم سے مار کھا کر گیا ہے وہ اپنے باپو اور نوکروں کو لے آئے گا!"

"بھاگنے والے ڈرپوک ہوتے ہیں" اس نے غصے سے لال پیلا ہو کر جواب دیا

مجید نے آگے بڑھ کر اس کی پیٹھ پر تھپکی دیتے ہوئے کہا "دیکھو داؤد! میرا بھائی ہے نا آخر!"

داؤد نے کہا "دیکھو مجید! اس کے باپ یا نوکروں نے تم پر ہاتھ اٹھایا تو مجھے تمہارا ساتھ دینا پڑے گا اور تم جانتے ہو کہ انہوں نے ایک دفعہ مجھے پیٹا تھا اور میرے باپ کی بے عزتی کی تھی۔"

مجید نے تن کر کہا "آج اگر وہ آئے تو ہم تمہارا بدلہ لیں گے"

"لیکن مجھے اس کی سزا ضرور ملے گی، وہ کہیں گے یہ سب میری شرارت ہے"

سلیم نے کہا "دیکھو داؤد تم چلے جاؤ ہم نہیں جائیں گے"

داؤد نے بگڑ کر کہا "چلا جاؤں، تمہیں اور مجید کو چھوڑ کر، نہیں میں تمہارے ساتھ ہوں۔ وہ زیادہ سے زیادہ میرے باپ کی بے عزتی کریں گے لیکن اس کے بدلے

میں میں موہن سنگھ کے سر کا ایک بال نہیں چھوڑوں گا۔''

سکول والے گاؤں کے لڑکوں کو ایک طرف اس بات کا احساس تھا کہ موہن سنگھ اپنے باپ اور نوکروں کو لے کر ضرور آئے گا۔ دوسری طرف وہ یہ سمجھ چکے تھے کہ مجید، سلیم اور ان کے ساتھی بھاگنے کی بجائے ان کا مقابلہ کرنے کا ارادہ کر چکے ہیں، اس لیے وہ اپنے اپنے گھروں کی طرف چل دیے۔ ان میں سے بعض دور سے تماشا دیکھنے کے شوق میں قریب ہی ایک بڑ کے درخت پر چڑھ گئے داؤد اور مجید کے آ جانے سے باہر کے دیہات کے وہ لڑکے جو پہلی لڑائی میں غیر جانبدار رہے تھے اب ان کے ساتھ ہو چکے تھے۔

☆☆☆☆☆

مجید کے مشورے پر لڑکوں نے اپنے بستے اٹھا کر پاس ہی گنے کے ایک کھیت میں چھپا دیے اور جوہڑ کے کنارے بیٹھ گئے۔

مجید نے کہا ''دیکھو! جب تک میں نہ کہوں تم میں سے کوئی نہ اٹھے، جب کوئی آئے گا میں خود اس کے ساتھ بات کروں گا۔''

مجید نے اپنی پگڑی اتار کر اسے دوہرا کیا اور پھر کوئی دو سیر گیلی مٹی لے کر اس کا گولہ بنایا اور ایک سرے میں باندھ دیا اس کے بعد وہ اٹھا اور ایک طرف ہو کر بولا۔'' داؤد جانتے ہو یہ کیا ہے؟''

داؤد کی خاموشی پر اس نے خود ہی جواب دیا ''یہ ایک ہتھیار ہے میں نے یہ چچا

افضل سے سیکھا ہے چچا افضل نے ایک دفعہ اس کے ساتھ ایک ڈاکو کو اس کے گھوڑے سمیت گرا لیا تھا۔“

”کیسے؟“ داؤد نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا

مجید نے پگڑی کا ایک سرا دونوں ہاتھوں میں پکڑ لیا اور اسے اپنے سر سے اوپر گھماتے ہوئے بولا ”دیکھو! اب یہ لاٹھی سے زیادہ خطرناک ہے اگر کوئی اس کی لپیٹ میں آ جائے تو وہیں گر پڑے گا“ مجید نے عملی ثبوت دینے کے لیے پگڑی کو تیزی سے گھماتے ہوئے مٹی والا سرا زمین پر دے مارا۔ اس سے گیلی اور نرم زمین میں ایک چھوٹا سا گڑھا پڑ گیا۔ مجید لڑکوں کے قریب آ بیٹھا اور ان کی طرف داد طلب نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

داؤد نے جلدی سے اپنی پگڑی اتاری اور دونوں ہاتھوں سے مٹی کھودتے ہوئے کہا ”ارے یہ تو بہت اچھا ہتھیار ہے لیکن ۔۔۔۔۔ یہ مٹی نرم ہے اگر اس کی بجائے!“ وہ اپنا فقرہ پورا کیے بیر اٹھ کر ایک کنوئیں کی طرف بھاگا اور ٹوٹی ہوئی منڈیر سے دو اینٹیں اٹھا لایا۔ اس نے ایک اینٹ اپنی پگڑی کے ساتھ باندھ لی اور دوسری مجید کو دیتے ہوئے کہا ”مٹی کی بجائے یہ ٹھیک ہے مجید!“

باقی لڑکے بھی اپنے اپنے لیے اینٹیں اٹھا لائے تھوڑی دیر میں وہ سب اس جدید قسم کے ہتھیار سے مسلح ہو چکے تھے لیکن سلیم کو اس بات کا افسوس تھا کہ وہ پگڑی جیسی کارآمد چیز کی بجائے اپنے سر پر ٹوپی پہن کر آیا ہے۔

اچانک اس کی نگاہ جوہڑ کے دوسرے کنارے پر پڑی خیردین کمہار گدھوں کے

پیچھے بھاگنے کے بعد تازہ دم ہونے کے لیے جوہڑ میں نہا رہا تھا۔اس کے کپڑے کنارے پر پڑے ہوئے تھے عام حالات میں سلیم شاید ایسی حرکت نہ کرتا لیکن معاملہ نازک تھا، بھاگتے ہوئے دوسرے کنارے پر پہنچ کر خیر دین کی پگڑی اٹھالی خیر دین دوسری طرف منہ کر کے ڈبکیاں لگا رہا تھا اس لیے اس کی نگاہ سلیم پر نہ پڑی۔

جب سلیم اپنے ساتھیوں کے پاس پہنچا تو موہن سنگھ اور اس کے تیس نوکر گاؤں سے نکل کر جوہڑ کا رخ کر رہے تھے۔اب اینٹ مہیا کرنا مشکل تھا۔اس لیے سلیم کو مٹی پر اکتفا کرنا پڑا۔

موہن سنگھ کے ہاتھ میں ہاکی تھی اور اس کے نوکروں کے ہاتھوں میں لاٹھیاں تھیں۔داؤد نے کہا ''مجید اس کالی پگڑی والے نے میرے باپ کو جوتے مارے تھے۔اس کے ساتھ میں نپٹوں گا۔''

مجید نے کہا ''لیکن جب تک میں نہ کہوں تم میں سے کوئی نہ اٹھے''

جب وہ قریب آگئے تو مجید اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔نوکروں نے جب دیکھا کہ ان بچوں کے پاس ان لاٹھیوں کا کوئی جواب نہیں تو اطمینان سے ان کے قریب کھڑے ہو گئے۔

ایک آدمی نے کہا ''موہن سنگھ کو کس نے مارا ہے؟''

موہن سنگھ سلیم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے چلایا ''مجھے اس نے مارا ہے''

مجید نے کہا ''تم انہیں کیوں لائے ہو اپنے باپو کو ساتھ کیوں نہیں لائے؟''

موہن سنگھ نوکروں کی طرف دیکھ کر پھر چلایا ''یہ سلیم کا بھائی ہے اور یہ تمام لڑکے اس کے ساتھی ہیں، ان سب کو پکڑ لو!''

نوکر نے کہا ''تم سب ہمارے ساتھ سردار جی کے پاس چلو''

مجید نے بے پروائی سے کہا ''ارے دیکھے ہیں تمہارے سردار جی! نہیں جاتے ہم اس کے پاس۔''

نوکر کو اس غیر متوقع جواب نے ایک لمحہ کے لیے پریشان کر دیا وہ مڑ کر اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھنے لگا کالی پگڑی والا پست قامت آدمی کچھ دیر غور سے داؤد کی طرف دیکھنے کے بعد اچانک چلا اٹھا ''ارے یہ نوردین تیلی کا لڑکا ہے اب تیلی کے بچے، تمہیں وہ مار بھول گئی؟''

سلیم اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور بولا ''داؤد پر تمہیں اس لیے غصہ آتا ہے کہ اس کا باپ غریب ہے موہن سنگھ کو میں نے مارا ہے اور جب بھی یہ گالی دے گا میں اسے ماروں گا۔''

نوکر نے سلیم کو ڈرانے کی نیت سے لاٹھی اٹھائی لیکن اس سے قبل مجید کے ہاتھ حرکت میں آ چکے تھے پگڑی کے ساتھ تیزی سے گھومتی ہوئی اینٹ اس کو پسلی پر لگی اور وہ لڑکھڑاتا ہوا چند قدم پیچھے ہٹ کر زمین پر بیٹھ گیا اور دونوں ہاتھ پسلی پر رکھ کر کراہنے لگا۔ اس کے ساتھی حیرت زدہ ہو کر اس کی طرف دیکھ رہے تھے مجید نے اچانک اس کی لاٹھی اٹھا لی ایک آدمی نے مجید کو لاٹھی مارنے کی کوشش کی لیکن وہ جست لگا کر ایک طرف ہو گیا اتنی دیر میں مجید کے باقی ساتھی میدان میں آ چکے تھے

مجید کے مد مقابل نے اس پر دوسرا وار کرنے کے لیے لاٹھی بلند کی لیکن پیچھے سے گلاب سنگھ کی پگڑی کے ساتھ گھومتی ہوئی اینٹ اس کی گردن پر لگی اور اس کے ساتھ ہی مجید نے اس کی ٹانگ پر لاٹھی ماردی مجید نے دوسری بار لاٹھی اٹھائی تو وہ بھاگ نکلا۔

وہ آدمی جس نے سب سے پہلے مجید سے چوٹ کھائی تھی اب اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن چار لڑکے اس کے گرد کھڑے تھے ایک اینٹ اس کے سر پر لگی اور وہ منہ کے بل لیٹ گیا۔

موہن سنگھ شکست کے آثار دیکھ کر چند قدم دور ہٹ کر کھڑا ہو گیا تھا سلیم آنکھ بچا کر ایک لمبا چکر کاٹنے کے بعد اس کے قریب جا پہنچا موہن سنگھ اس وقت خبر دار ہوا جب وہ سلیم کی زد میں آ چکا تھا جست لگانے سے پہلے اس کی ٹانگیں پگڑی کی لپیٹ میں آ گئیں اور وہ منہ کے بل گر پڑا۔ سلیم کے دو چار گھونسے کھانے کے بعد وہ اٹھا اور اپنی پگڑی اور آدھی قمیض سلیم کے ہاتھوں میں چھوڑ کر بھاگ نکلا۔

سلیم بھاگتا ہوا اپنے ساتھیوں کے قریب پہنچا تو لڑائی کا آخری حصہ ایک دلچسپ مشغلے میں تبدیل ہو چکا تھا۔ کالی پگڑی والے ٹھنگنے قد کے آدمی پر داؤد نے قسمت آزمائی کی تھی، وہ اینٹ کی ضرب سے تو بچ گیا لیکن داؤد کی پگڑی اس کی گردن کے گرد لپٹ چکی تھی داؤد نے پگڑی کو زور سے جھٹکا دیا اور وہ زمین پر آ رہا۔ داؤد اسے گھسیٹ رہا تھا اور اس نے گلا گھٹ جانے کے خوف سے پگڑی کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ رکھا تھا۔

داؤد کا یہ کھیل دلچسپ سمجھ کر باقی لڑکے بھی اس کے گرد جمع ہو گئے۔

موہن سنگھ کا دوسرا نوکر جو زمین پر لیٹا ہوا اپنے چاروں طرف گھومنے والی پگڑیوں کو لاٹھیوں سے زیادہ خطرناک سمجھ رہا تھا، اپنے پہریداروں کی توجہ دوسری طرف مبذول ہوتی دیکھ کر اٹھا اور کسی توقف کے بغیر گاؤں کی طرف بھاگ نکلا اور مجید نے جاتے جاتے اس کی پشت پر ایک لاٹھی رسید کر دی۔

جنگ ختم ہو چکی تھی دشمن میدان چھوڑ کر بھاگ چکا تھا فتح حاصل کرنیوالوں کو مال غنیمت میں دو لاٹھیاں، دو جوتے، ایک پگڑی اور پھٹی ہوئی قمیض کا ایک ٹکڑا ہاتھ لگا۔ اس کے علاوہ ایک قیدی بھی تھا جسے داؤد نے زندہ گرفتار کر لیا تھا۔ کالی پگڑی والا ٹھنگنے قد کا آدمی اپنی زندگی میں پہلی بار یہ محسوس کر رہا تھا کہ پگڑی جیسی بے ضرر چیز کا اگر غلط استعمال کیا جائے تو یہ ایک خوفناک ہتھیار ثابت ہو سکتی ہے اس کے علاوہ اسے اس بات کا عملی تجربہ ہو رہا تھا کہ لڑکے خاص کر سکولوں کے لڑکے غصے کی نسبت خوشی کی حالت میں زیادہ خطرناک ہوتے ہیں، وہ ان سے جان چھڑانے کے لیے زمین پر ناک کے ساتھ لکیریں نکال چکا تھا لیکن اس کے بعد کسی نے کہہ دیا کہ اس کی پگڑی کالی ہے، اس کا منہ بھی کالا کر دو۔ چنانچہ آٹھ دس دواتوں کی سیاہی اس کے منہ پر مل دی گئی پھر کسی نے قہقہہ لگایا اور وہ سمجھ گیا کہ اب کوئی نئی مصیبت آئے گی چنانچہ قہقہہ لگانے والے نے یہ کہہ کر خدشات پورے کر دیے کہ اب اسے جوتے لگاؤ اور اس کے سر پر جوتوں کی بارش ہوئی۔

پھر کسی نے کہا "چلو اسے اپنے گاؤں لے چلیں۔ بچے اسے دیکھ کر خوش ہوں

گے''اس کا دل بیٹھ گیا مکے، گھونسے، لاتیں اور جوتے کھانے کے بعد اس میں بچوں کے کسی نئے گروہ کے لیے دلچسپی کا سامان مہیا کرنے کی سکت نہ تھی۔ داؤد نے کہا'' اچھا قسم کھاؤ کہ تم پھر سکول کے کسی لڑکے سے نہیں لڑو گے!''

اس نے کہا''میں قسم کھاتا ہوں''

''اچھا کہو کہ تم ایک بندر ہو''

اس نے کہا''میں ایک بندر ہوں''

''اور میں بندر کی طرح ناچ سکتا ہوں''

''اور میں بندر کی طرح ناچ سکتا ہوں''

مجید نے اس کی پگڑی اس کے گلے میں باندھ دی اور کہا''شاباش! میرے بندر اب ناچ کر دکھاؤ!''وہ بے بسی کی حالت میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا لڑکے شور مچانے لگے'' اسے ناچنا نہیں آتا، اس نے جھوٹ بولا ہے ماسٹر جی جھوٹ بولنے والوں کے کان پکڑواتے ہیں۔''

داؤد نے کہا''اچھا کان پکڑو!''

اس نے دونوں ہاتھ اٹھا کر کان پکڑ لیے لڑکے اب مارے ہنسی کے لوٹ پوٹ ہو رہے تھے۔

مجید نے کہا''ارے بندر، یوں نہیں گلاب سنگھ تم اسے کان پکڑ کے دکھاؤ۔ گلاب سنگھ نے اس کے سامنے نمونہ پیش کر کے اسے اس سیدھے سادھے مسئلے کی پیچیدگیوں کا احساس دلایا۔''

وہ کان پکڑے سوچ رہا تھا کہ اب اس کے ساتھی سردار جی کے پاس پہنچ گئے ہوں گے، وہ تھوڑی دیر میں آدمیوں کا نیا جتھہ لے کر پہنچ جائیں گے۔ جب اسے بہت زیادہ کوفت ہونے لگی تو وہ سوچ رہا تھا کہ ابھی موسلا دھار بارش شروع ہو جائیگی اور لڑکے بھاگ جائینگے۔ جب تکلیف نا قابل برداشت ہوگئی تو وہ چلا تھا ’’مجھے چھوڑ دو، سردار جی تھوڑی دیر میں گاؤں کے تمام آدمیوں کو لے کر آجائیں گے۔ تم بھاگ جاؤ‘‘

لڑکے اچانک سنجیدہ ہو گئے۔

داؤد نے کہا ’’چلو مجید! گاؤں کے آدمیوں سے ہم نہیں لڑ سکتے، اگر تم لڑائی کرنا چاہتے ہو تو ایک لڑکے کو اپنے گاؤں بھیج دو‘‘

کسی نے پیچھے سے بارعب آواز میں کہا ’’یہاں کیا ہو رہا ہے؟‘‘

لڑکے ادھر ادھر ہٹ گئے اور کان پکڑنے والا اس آواز کو تائید غیبی سمجھ کر کھڑا ہو گیا۔

یہ سلیم کا چچا افضل تھا اور اس کے ساتھ گلاب سنگھ کا باپ شیر سنگھ تھا۔ ان کے ہاتھوں میں لاٹھیاں تھیں اور لڑکوں کے لیے اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ انہیں جلال نے بھیجا ہے۔

افضل اور شیر سنگھ نے جنگی قیدی کے چہرے پر سیاہی دیکھ کر قہقہہ لگایا اور بچوں کی طرف متوجہ ہو کر پوچھا ’’یہ کون ہے؟‘‘

اس کے جواب میں سلیم نے ساری سرگزشت سنا دی۔

افضل اور شیر سنگھ ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے شیر سنگھ نے کہا ''چرن سنگھ بڑا کمینہ ہے یہ دوسروں کے بچوں کو کیا سمجھتا ہے۔ چلو اس کے پاس چلیں''

افضل نے کہا ''یہیں ٹھہرو! اب وہ زیادہ آدمی لے کر آئے گا''

سلیم نے کہا'' چچا جی اس سے پہلے اس نے داؤد اور اس کے باپ کو اپنے نوکروں سے پٹوایا تھا، آج داؤد نے ہمارا ساتھ دیا ہے اگر آپ نے اسے نہ روکا، تو وہ پھر اس کے باپ کی بے عزتی کرے گا۔''

''ہم اسے ٹھیک کر دیں گے'' یہ کہہ کر افضل سردار کے نوکر کی طرف متوجہ ہوا'' کیوں بدمعاش تمہیں لڑکوں کے مقابلے میں لاٹھیاں اٹھا کر آتے ہوئے شرم نہ آئی؟''

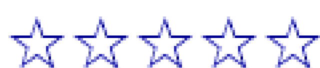
اس نے سہمی ہوئی آواز میں کہا ''چودھری جی! ہمیں معلوم نہ تھا کہ یہ آپ کے بچے ہیں''

''دیکھو بدمعاش! بچے سب ایک جیسے ہیں آئندہ اگر تم نے کسی لڑکے پر ہاتھ اٹھایا تو تمہاری خیر نہیں!''

''نہیں چودھری جی!''

''اچھا جاؤ جا کر اپنا حلیہ ٹھیک کرو''

نوکر چند قدم دور جا کر جوہڑ کے کنارے پر بیٹھ گیا۔



ہلکی ہلکی بارش شروع ہو چکی تھی گاؤں سے آدمیوں کا شوروغوغا سن کر افضل اور شیر سنگھ چند قدم دور ایک جھاڑی کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گئے۔ افضل اور شیر سنگھ کی موجودگی میں لڑکوں کو کوئی پریشانی نہ تھی۔ وہ اطمینان سے کبڈی کھیل رہے تھے۔ موہن سنگھ کا باپ چرن سنگھ قریباً دس آدمیوں کے ساتھ نمودار ہوا وہ چیختے چلاتے اور گالیاں دیتے چلے آرہے تھے چرن سنگھ کہہ رہا تھا ''دیکھو یہ بھاگ نہ جائیں ان سب کو پکڑ لو'' اس کے ساتھی لڑکوں کو پکڑنے یا مارنے سے زیادہ انہیں بھگانے کے خواہش مند تھے۔ گاؤں سے نکلتے وقت ان کی زبانیں کافی جوش وخروش کا مظاہرہ کر رہی تھیں انہیں یقین تھا کہ اگر لڑکے پہلے ہی بھاگ نہیں گئے تو انہیں دیکھ کر بھاگ جائیں گے لیکن وہ انتہائی اطمینان کے ساتھ کبڈی کھیل رہے تھے اور گاؤں کے آدمیوں کا جوش وخروش پریشانی میں تبدیل ہو رہا تھا۔

چرن سنگھ یہ محسوس کر رہا تھا کہ یہ گستاخ لڑکے اس کے زخموں پر نمک چھڑک رہے ہیں انہوں نے اس کے لڑکے پر ہاتھ اٹھایا تھا۔ اس کے نوکروں کے ہاتھوں مار کھانے کی بجائے الٹا انہیں پیٹ ڈالا تھا وہ ایک ہزار ایکڑ کا مالک تھا۔ اس کے ساتھ گاؤں کے دس جنگجو آدمی تھے۔ وہ گلا پھاڑ کر اپنے خوفناک عزائم کا اظہار کر رہا تھا لیکن ان سب باتوں کے باوجود یہ لڑکے کبڈی کھیل رہے تھے۔ صرف اس کے گاؤں کی حدود میں ہی نہیں بلکہ اس کے اپنے کھیت میں، ان کی بے پروائی اور بے توجہی یہ ظاہر کر رہی تھی کہ وہ اس گاؤں کے مالک ہیں۔ یہ زمین ان کی ہے اور انہیں گالیاں اور دھمکیاں دینے والے کسی اور ملک کے باشندے ہیں اور وہ ان پر حملہ

کرنے کی بجائے یونہی شور مچاتے ہوئے ان کے قریب سے گزر جائیں گے۔ چرن سنگھ کے نوکر جو تھوڑی دیر پہلے شکست کھا کر گئے تھے، اسے بتا چکے تھے کہ ان کی پگڑیاں لاٹھیوں سے زیادہ خطرناک ہیں۔ لیکن اب وہ خالی ہاتھ کھیل رہے تھے۔ حملہ آور جوں جوں محاذ جنگ سے قریب آ رہے تھے، ان کی رفتار اور گفتار میں سنجیدگی آ رہی تھی۔

جب وہ کوئی پچاس گز کے فاصلے پر تھے تو افضل اور شیر سنگھ جھاڑی کے عقب سے نکلے اور چند قدم آگے بڑھ کر کھڑے ہو گئے۔

حملہ آوروں پر اچانک ایک سکوت طاری ہو گیا۔ ان کی بجائے اب لڑکے چلا رہے تھے۔

افضل نے لڑکوں کو ڈانٹ کر خاموش کر دیا اور چرن سنگھ اس حرکت کو ایک اچھا شگون سمجھ کر چند قدم آگے بڑھا اس نے کہا ''چودھری افضل! ان لڑکوں نے میرے لڑکے اور میرے نوکروں کو مارا ہے۔''

افضل نے جواب دیا ''اگر تمہارے لڑکے اور نوکروں نے ان لڑکوں کو اس قسم کی گالیاں دی تھیں جیسی تم ابھی دے رہے ہو تو انہوں نے بہت اچھا کیا ہے۔''

شیر سنگھ نے کہا ''چرن سنگھ ہمارا خیال تھا کہ تم اپنے گاؤں کے سارے آدمی لے کر آؤ گے۔ تمہارے بال سفید ہو گئے لیکن عقل نہ آئی اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ تمہارے لڑکے کے سوا باقی تمام بچے لاوارث ہیں تو ان میں سے کسی کو ہاتھ لگا کر دیکھو!''

چرن سنگھ نے فدویانہ انداز میں کہا ''شیر سنگھ تمہارے ساتھ میری کوئی لڑائی نہیں

لیکن ان لڑکوں نے میرے لڑکے کو بہت مارا ہے۔‘‘

شیر سنگھ نے کہا ’’تمہارے لڑکوں کو صرف دو لڑکوں نے مارا ہے ان میں سے ایک میرا لڑکا ہے اور دوسرا افضل کا بھتیجا ہے۔ ہم نے اپنے بچوں کو گالیاں نہیں سکھائیں لیکن گالیوں کا جواب دینا ضرور سکھایا ہے۔ تمہارے لڑکے نے انہیں گالیاں دی تھیں، اب تمہیں اس بات کا افسوس نہیں ہونا چاہیے کہ اسے گالیوں کا جواب دیا گیا ہے۔ اگر تمہاری تسلی نہیں ہوئی تو ہمت کرو، تمہارے ساتھ دس آدمی ہیں ہم صرف دو ہیں اگر تم کہو تو ہم اپنی لاٹھیاں بھی پھینک دیتے ہیں لیکن یہ فوج جو تم اپنے ساتھ لے کر آئے ہو لڑنے والی نظر نہیں آتی۔‘‘

افضل نے کہا ’’چرن سنگھ کو صرف بچوں پر غصہ آتا ہے۔ سلیم! گلاب! مجید! ذرا آگے ہو جاؤ۔ سردار جی اپنا غصہ نکال لیں۔‘‘

یہ تینوں لڑکے آگے بڑھ کر چرن سنگھ کے قریب کھڑے ہو گئے چرن سنگھ انتہائی پریشانی کی حالت میں ادھر ادھر دیکھ رہا تھا اگر اس کے سامنے کوئی اور ہوتا تو وہ کب کا آپے سے باہر ہو گیا ہوتا لیکن افضل اور شیر سنگھ کا معاملہ مختلف تھا۔ بالآخر جہاں طاقت نے جواب دے دیا وہاں عقل کام آئی۔ اس نے کہا ’’اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ موہن سنگھ نے تمہارے بچوں کو گالیاں دی ہیں تو میں خود اس کی مرمت کرتا۔‘‘

افضل نے ہنستے ہوئے آگے بڑھ کر کہا ’’بچے اپنے باپ اور نوکروں سے گالیاں سیکھتے ہیں اب جاؤ سردار جی ہم تمہارے ساتھ لڑنے نہیں آئے تھے یہ بچوں کا معاملہ تھا کل یہ پھر ایک ہو جائیں گے بڑوں کو ان کی باتوں میں نہیں آنا چاہیے اگر تم اپنے

لڑکے کے کہنے پر لوگوں کے ساتھ لڑتے پھروگے تو اپنی عزت خراب کروگے۔"

اس کے بعد فریقین میں تھوڑی دیر تک مصالحانہ باتیں ہوتی رہیں سردار چرن سنگھ، افضل اور شیر سنگھ کو اپنے گھر کا پانی پلانے اور اپنے باغ کے آم کھلانے پر اصرار کر رہا تھا اور وہ معذرت کر رہے تھے۔

ہلکی ہلکی بارش شروع ہو چکی تھی وہ اپنے گاؤں کا رخ کرنے والے تھے کہ جوہڑ کے دوسرے کنارے کسی کی چیخ و پکار نے انہیں اس طرف متوجہ کر دیا۔ پنڈت رام پرشاد چلا رہا تھا "خیرو کے بچے! یہ بے زبان ہے، ارے پاپی اسے نہ مارو!" اور خیرو بے تحاشا اس کی گائے پر ڈنڈے برسا رہا تھا۔ گائے بدحواس ہو کر ادھر ادھر بھاگ رہی تھی اور خیرو اسے گھیر گھیر کر مار رہا تھا۔

لوگوں نے بارہا گدھوں پر خیرو کا عتاب دیکھا تھا لیکن پرائی گائے کے ساتھ اس کا یہ سلوک ان کے لیے ایک معما تھا۔

تھوڑی دیر میں وہ سب جوہڑ کے دوسرے کنارے پہنچ کر خیرو کو برا بھلا کہہ رہے تھے اور خیرو کہہ رہا تھا "سردار جی! چودھری جی! میری بھی سنو۔ یہ گائے میری پگڑی نگل گئی ہے غضب خدا کا سات گز کی پگڑی۔ بالکل نئی، بہاری لال سے پوچھو۔ میں نے پچھلے مہینے اس سے خریدی تھی مجھے پگڑی کا اتنا افسوس نہیں لیکن اس کے ساتھ ایک تعویذ بندھا ہوا تھا اور میں نے اس کے لیے پیر ولایت شاہ کو پانچ روپے دیے تھے۔"

افضل نے کہا "ارے تم پاگل تو نہیں ہو گئے گائے تمہاری پگڑی کیسے نگل گئی؟"

اس نے کہا ''چودھری جی خدا کی قسم میری پگڑی گائے نے کھالی ہے میں کپڑے اتار کر نہا رہا تھا۔۔۔۔اور گائے کے سوا کوئی یہاں نہیں تھا۔''

چرن سنگھ نے کہا ''ارے کہیں پانی میں گر گئی ہوگی۔''

''سردار جی، میں کنارے کے ساتھ ساتھ پانی میں بھی تلاش کر چکا ہوں۔''

افضل نے کہا ''تو پھر کسی اور جگہ رہ گئی ہوگی جاؤ جا کر گھر میں تلاش کرو''

''جی میں گھر میں بھی دیکھ آیا ہوں میں آس پاس کے کھیتوں میں بھی تلاش کر چکا ہوں۔۔۔۔پھر مجھے خیال آیا کہ شاید میری پگڑی پانی میں گر گئی ہے۔میں دوبارہ کپڑے اتار کر پانی میں تلاش کر رہا تھا تو یہ گائے آ کر میری چادر کا کونہ چبا رہی تھی۔۔۔۔دیکھو!'' اس نے کنارے پر پڑی ہوئی چادر اٹھا کر ایک کونہ انہیں دکھاتے ہوئے کہا ''اگر میں فوراً نہ چھڑاتا، تو وہ اسے بھی نگل جاتی۔''

سلیم، خیرو کی پگڑی بغل میں دبائے ایک طرف کھڑا تھا اس نے مجید کے کان میں کچھ کہا مجید نے داؤد سے سرگوشی کی اور اس نے سلیم سے پگڑی لے کر اپنی قمیض کے دامن میں چھپا لی اور ادھر ادھر دیکھنے کے بعد چپکے سے جوہڑ کے کنارے رکھ دی۔

سکول کے لڑکے ایک دوسرے کے ساتھ کانا پھوسی کرنے کے بعد ہنس رہے تھے اچانک خیرو کے گاؤں کے ایک آدمی نے کہا ''ارے وہ کیا ہے؟''

''ابے خیرو کے بچے اندھے تو نہیں ہو گئے تم'' دوسرے آدمی نے آگے بڑھ کر خیرو کی پگڑی اٹھاتے ہوئے کہا۔

کیچڑ اور مٹی سے خیرو کی پگڑی کا حلیہ بہت حد تک بدل چکا تھا لیکن اس کے ساتھ بندھا ہوا تعویذ دیکھ کر اسے یہ تسلیم کرنا پڑا کہ یہ پگڑی میری ہے تاہم وہ قسمیں کھا رہا تھا کہ اس سے پہلے پگڑی یہاں سے غائب تھی پنڈت رام پرشاد جس نے انتہائی صبر سے گزشتہ صورت حال کا سامنا کیا تھا اب آپے سے باہر ہو رہا تھا۔

بارش کی رفتار نے لوگوں کو زیادہ دیر ٹھہرنے کا موقع نہ دیا جب وہ رخصت ہو رہے تھے تو سلیم نے آگے بڑھ کر دبی زبان میں افضل سے کہا ''چچا یہ داؤ د پر غصہ اتاریں گے''

''بیٹا! تم فکر نہ کرو'' یہ کہہ کر افضل آگے بڑھا اور چرن سنگھ کو بازو سے پکڑ کر ایک طرف لے گیا کچھ دیر دونوں آپس میں باتیں کرتے رہے۔

جب افضل اور شیر سنگھ بچوں کو لے کر اپنے گاؤں کی طرف چل پڑے تو داؤد بھی ان کے ساتھ ہو لیا۔ تھوڑی دور جا کر افضل نے کہا ''داؤد! بے فکر ہو کر اپنے گھر جاؤ میں نے تمہارے متعلق اس کے کان کھول دیے ہیں اگر وہ اب بھی تمہیں کچھ کہے تو میرے پاس چلے آنا۔''

اگلے دن لڑکوں نے موہن سنگھ کے طرز عمل میں ایک غیر متوقع تبدیلی محسوس کی لڑکے اسے کل کے واقعات سنا سنا کر چھیڑ رہے تھے اور وہ سر جھکائے خاموش بیٹھا تھا۔ اس کے پڑوس کے لڑکوں نے بتایا کہ اس کے باپ نے گھر پہنچ کر سارا غصہ اس پر نکالا تھا۔



افضل اور شیر سنگھ کے سامنے چرن سنگھ کا احساس مرعوبیت بلاوجہ نہ تھا۔ علاقے میں کسی کو بھی ان کے سامنے دم مارنے کی جرأت نہ تھی ان کی دوستی اور بہادری کی داستانیں دور دور تک مشہور تھیں۔ دونوں چھ چھ فٹ کے تنومند اور خوش شکل جوان تھے دونوں کو کشتی لڑنے، گتکا کھیلنے اور گھوڑوں پر سواری کرنے کا شوق تھا۔

افضل اپنے بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا جب سے اس کا بڑا بھائی علی اکبر تحصیلدار رہا تھا اس نے اپنی جیب سے افضل کی خاطر دو نوکر رکھ دیے تھے اور افضل کو کھیتی باڑی کے کاموں سے بہت حد تک چھٹی مل گئی تھی۔

شیر سنگھ اپنے بھائیوں میں سب سے بڑا تھا اور اس کے چھوٹے اسے کام کو ہاتھ نہیں لگانے دیتے تھے۔

افضل نے پرائمری تک تعلیم پائی تھی اور وہ ہیر وارث شاہ پڑھ لیتا تھا شیر سنگھ نے دوسری جماعت سے اسکول چھوڑ دیا تھا اور اسے ''الف آم'' ''ب بکری'' اور ''ت تختی'' کے سوا سب کچھ بھول چکا تھا۔

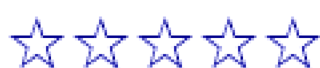
تاہم افضل کی زبان سے بار بار سننے کی وجہ سے اسے بھی ہیر وارث شاہ کے کئی اشعار زبانی یاد ہو گئے تھے لوگوں پر رعب ڈالنے کے لیے وہ کوئی نہ کوئی کتاب کھول کر اپنے سامنے رکھ لیتا اور افضل سے سیکھی ہوئی لے میں وارث شاہ کے شعر سنانے لگتا۔ اس کے لیے ہر کتاب وارث شاہ کی ہیر تھی۔ ایک دفعہ سلیم نے اس کے ہاتھ میں دوسری جماعت کی کتاب دیتے ہوئے کہا ''چچا پڑھ کر سناؤ'' اور شیر سنگھ نے یونہی کتاب کھول کر ہیر کے پندرہ بیس شعر سنا دیے۔

علاقے کے دیہاتی میلے افضل اور شیر سنگھ کے بغیر بے رونق سمجھے جاتے، وہ میلوں میں جاتے، کشتی لڑتے، کبڈی کھیلتے اور اگر کوئی مجبوری پیش آجاتی تو لٹھ بازی بھی کر لیتے، دیہاتی میلے کبھی کبھی لڑائی کا اکھاڑہ بھی بن جاتے تھے مشہور و معروف ڈاکو اپنے حریفوں کے ساتھ طاقت آزمائی کے لیے میلوں میں آتے، ایک شراب کے نشے میں لاٹھی بلند کر کے پکارتا کہ فلاں کہاں ہے؟ دوسری طرف سے اس کے چیلنج کا جراب ملتا پھر دونوں گروہ ایک دوسرے کی طرف بڑھتے، لاٹھیاں آپس میں ٹکراتیں، سر پھٹتے، دکانداروں کی چھابڑیاں الٹ جاتیں کمزور آدمی پیروں کے نیچے مسلے جاتے ایک گروہ اپنے لیڈر سمیت بھاگ نکلتا دوسرا اس کا پیچھا کرتا۔ پھر جب معاملہ ٹھنڈا ہو جاتا تو پولیس پہنچ جاتی اور چند آدمیوں کو ہتھکڑیاں لگ جاتیں۔

لیکن جب سے افضل اور شیر سنگھ نے میلوں میں آنا شروع کیا تھا اس قسم کی وارداتیں بہت کم ہو گئی تھیں وہ لڑنے والوں کے بیچ میں کود پڑتے لیکن جب مصالحانہ کوششیں کامیاب نہ ہوتیں تو وہ لاٹھیاں اٹھا لیتے اور وہ نوجوان جو کشتی لڑنے یا کبڈی کھیلنے کی نیت سے میلے میں آتے تھے ان کا ساتھ دیتے۔

افضل اور شیر سنگھ کے خاندانوں میں تین پشتوں سے دشمنی چلی آتی تھی لیکن ان دونوجوانوں کی دوستی نے ان کے خاندانوں کی پرانی رنجشیں مٹا دیں۔

ان کی دوستی کی ابتدا بھی عجیب تھی:



گاؤں میں مشہور تھا کہ افضل کی گھوڑے علاقے کی تمام گھوڑیوں سے تیز بھاگتی ہے شیر سنگھ کے پاس معمولی گھوڑی تھی ایک دن شیر سنگھ اپنے بھائیوں اور باپ کے ساتھ کھیت میں چارا کاٹ رہا تھا کہ افضل اپنی گھوڑی بھگاتا ہوا قریب سے گزرا۔ شیر سنگھ اپنا کام چھوڑ کر کھڑا ہو گیا اور کچھ دیر گھوڑی کی طرف دیکھتا رہا اس کے بھائی بھی کام چھوڑ کر کھڑے ہو گئے۔

شیر سنگھ کے باپ اندر سنگھ نے کہا ''کیا دیکھتے ہو شیر سنگھ! تم نے گھوڑی کبھی نہیں دیکھی؟''

شیر سنگھ نے کہا ''باپو! یہ گھوڑی بڑی اچھی ہے''

اندر سنگھ نے کہا ''افضل کو اس گھوڑی پر بڑا گھمنڈ ہے اس نے تمہیں دکھانے کے لیے گھوڑی کو تیز کیا تھا''

شیر سنگھ نے کہا ''باپو ایک دن میں اپنے گھوڑے پر شہر کی طرف جا رہا تھا افضل میرے پاس سے گھوڑی کو سرپٹ دوڑاتا ہوا گزر گیا۔ وہ میری طرف مڑ مڑ کر دیکھتا اور ہنستا تھا۔''

اندر سنگھ درانتی زمین پر پھینک کر کھڑا ہو گیا اور پھر اپنی چادر اٹھا کر کندھے پر رکھتے ہوئے بولا ''شیر سنگھ افضل کا بھائی اگر تحصیل دار ہو گیا ہے تو پھر کیا ہوا۔ میں تمہیں ایسی دس گھوڑیاں خرید کر دے سکتا ہوں۔ میں آج ہی رقم کا بندوبست کرتا ہوں۔''

چوتھے دن اندر سنگھ اپنے بیٹے کے لیے ایک نئی گھوڑی خرید کر لے آیا۔

گاؤں میں پہلے ہی مشہور ہو چکا تھا کہ اندر سنگھ نئی گھوڑی خریدنے کے لیے گیا ہے اور اس کا بیٹا اسے افضل کی گھوڑی کے ساتھ بھگائے گا۔ چنانچہ گاؤں سے باہر کھیتوں میں ان دو گھوڑیوں کا مقابلہ ہوا۔ شیر سنگھ کا باپ اور اس کے بھائی بڑی امیدوں کے ساتھ مقابلہ دیکھنے کے لیے آئے تھے گاؤں کے جہاندیدہ لوگوں اور خاص کر چودھری رمضان نے شیر سنگھ کو یقین دلایا تھا کہ تمہاری گھوڑی عربی نسل کی ہے اور مقابلے میں افضل کی گھوڑی سے آگے نکل جائے گی لیکن جب دوڑ شروع ہوئی تو شیر سنگھ کی گھوڑی نے لوگوں کا شوروغوغا سن کر آگے بڑھنے کی بجائے الٹے پاؤں پیچھے چلنا شروع کر دیا۔ شیر سنگھ نے اسے چھڑی ماری تو وہ تیخ پا ہوگئی۔ لوگ قہقہے لگا رہے تھے شیر سنگھ نے اور دو تین چھڑیاں رسید کیں اور گھوڑی نے پچھلی ٹانگیں آسمان کی طرف اٹھا کر ہوائی دولتیاں چلانی شروع کر دیں۔

اتنی دیر میں افضل کوئی آدھ میل کا چکر لگا کر واپس آ چکا تھا۔ اس نے کہا "بات یہ ہے کہ لوگوں کا شور سن کر شیر سنگھ کی گھوڑی گھبرا گئی ہے۔"

چودھری رمضان اپنا حقہ اٹھائے آگے بڑھا اور بولا "افضل ٹھیک کہتا ہے تم لوگ شور مچاتے ہو ورنہ یہ گھوڑی خالص عربی نسل کی ہے شیر سنگھ ذرا اسے تھپکی دے کر ٹھنڈا کرو۔ افضل تم بھی اپنی گھوڑی کو دم لینے دو پھر مقابلہ ہوگا۔"

افضل اپنی گھوڑی سے اتر کر اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیر رہا تھا اور چودھری رمضان اسی طرح حقہ ہاتھ میں لیے شیر سنگھ کو ہدایات دے رہا تھا وہ کہہ رہا تھا "دیکھو شیر سنگھ! بھگاتے وقت اس کی باگ ڈھیلی چھوڑ دینا چھڑی اس وقت تک نہ مارنا جب تک یہ

بھاگنا نہ شروع کر دے۔ اب اس کی گردن پر پیار سے ہاتھ پھیرتے رہو۔ عربی نسل کے جانور میں غصہ زیادہ ہوتا ہے۔‘‘

چودھری رمضان نے آگے بڑھ کر گھوڑی کو چمکارتے ہوئے اس کی پشت پر ہاتھ رکھنے کی کوشش کی لیکن اس کی حقے کی چلم کا ڈھکنا اور ایک چھوٹا سا چمکتا جو لوہے کی باریک زنجیر کے ساتھ چلم سے بندھے ہوئے تھے، آپس میں ٹکرا کر کوئی ایسی آواز پیدا کر رہے تھے جو شاید اس ناتجربہ کار جانور کے لیے بارگوش ثابت ہو رہی تھی جونہی چودھری رمضان نے گھوڑی کی پشت کی طرف ہاتھ بڑھایا، گھوڑی نے پچھلی ٹانگیں اٹھا کر چلم کے ڈھکنے اور چمٹے کی آواز کا خیر مقدم کیا۔ چودھری رمضان بال بال بچ گیا لیکن حقہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر چند قدم دور جا پڑا۔ چودھری رمضان انتہائی بدحواسی کی حالت میں لوگوں کے قہقہے سن رہا تھا۔

افضل کے بڑے بھائی اسماعیل نے ہنستے ہوئے آگے بڑھ کر کہا ’’کیوں چودھری رمضان! گھوڑی عربی ہے نا؟‘‘

شیر سنگھ کے باپ کی قوت برداشت جواب دے چکی تھی اس نے غصے سے کانپتے ہوئے بھاگ کر یکے بعد دیگرے دو تین لاٹھیاں گھوڑی کی ٹانگوں پر رسید کر دیں اور گھوڑی اچھلنے، کودنے اور تیخ پا ہونے کے بعد ایک طرف بھاگ نکلی۔ افضل جلدی سے اپنی گھوڑی پر سوار ہو کر اس کے پیچھے ہو لیا لیکن کوئی تین سو گز بھاگنے کے بعد شیر سنگھ کی گھوڑی اچانک کھڑی ہو گئی اور جب افضل کی گھوڑی قریب پہنچی تو اس نے اس کی طرف دولتیاں اٹھا لیں۔ افضل نے اپنی گھوڑی کو ایک طرف ہٹا لیا لیکن شیر سنگھ کی

گھوڑی اندھا دھند فضا میں دولتیاں چلاتی رہی۔ اندر سنگھ پھر غضب ناک ہو کر آگے بڑھا لیکن اسماعیل نے بھاگ کر اس کا بازو پکڑ لیا اور کہا ''چچا جانے دو تمہاری گھوڑی الھڑ ہے، افضل اسے ٹھیک کر دیگا''

اندر سنگھ نے جھٹکے کے ساتھ اپنا بازو چھڑاتے ہوئے کہا ''اگر افضل گھوڑے کی سواری جانتا ہے تو میرے بیٹے نے گدھے پر سواری نہیں کی میں اسے دوسری گھوڑی لا کر دوں گا۔۔۔پھر دیکھوں گا شیر سنگھ سے کون جیتتا ہے؟''

اسماعیل نے کہا ''لیکن عربی گھوڑا نہ لے کر آنا چاچا!''

اندر سنگھ نے اگلے دن اپنا ایک کھیت گروی رکھا اور اس گھوڑی کو بیچنے اور نئی گھوڑی کو خریدنے کے لیے روانہ ہو گیا۔

پندرہ دن کے بعد وہ واپس آیا تو اس کے نیچے بادامی رنگ کا ایک خوبصورت گھوڑا تھا جس کے عوض اس نے اپنی گھوڑی اور تین سو روپے نقد دیے تھے گاؤں میں پہنچتے ہی اس نے چودھری رمضان کو چودھری رحمت علی کے پاس یہ پیغام دے کر بھیج دیا کہ چار دن کے بعد دوڑ ہو گی، اگر ہمت ہے تو اپنی گھوڑی شرط بد کر دوڑالو۔

چوتھے دن آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے گھوڑ دوڑ دیکھنے کے لیے اس گاؤں کے علاوہ دوسرے دیہات کے بہت سے لوگ بھی جمع ہو چکے تھے۔ دوڑ شروع ہونے سے پہلے اندر سنگھ نے کہا ''چودھری رحمت علی! خالی گھوڑے دوڑانے سے کیا فائدہ، کوئی شرط لگاؤ!''

رحمت علی نے جواب دیا ''اب ہم دونوں کے بال سفید ہو گئے ہیں اندر سنگھ!

شرط لگانا عقل کی بات نہیں''

''بس چودھری گھبرا گئے؟''

اسماعیل نے کہا ''اگر شرط کا شوق ہے تو شیر سنگھ سے کہو افضل کے ساتھ شرط باندھ لے۔''

اندر سنگھ نے کہا ''شیر سنگھ! لگاؤ افضل کے ساتھ پگڑی پگڑی کی شرط!''

افضل نے کہا ''تم گھاٹے میں رہو گے میں شیر سنگھ کی پگڑی کے عوض اپنی گھوڑی کی شرط لگاتا ہوں۔''

اندر سنگھ نے کہا ''اگر ہار گئے تو؟''

افضل سنگھ نے کہا ''اگر ہار گیا تو گھوڑی تمہاری''

اندر سنگھ نے کہا ''اپنے باپ سے پوچھ لو''

رحمت علی نے کہا ''مجھ سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے، یہ گھوڑی افضل کی ہے، اسے اس کے بھائی نے لے کر دی ہے۔ ہار جائے گا تو اور لے دے گا۔''

گھوڑ دوڑ شروع ہوئی سواروں نے ایک میل کے فاصلے پر پیپل کے درخت کے اوپر سے چکر کاٹ کر آنا تھا۔ دوسری طرف گاؤں کے چند عمر رسیدہ آدمی پہلے ہی پہنچ چکے تھے۔ درخت تک پہنچنے میں شیر سنگھ کا گھوڑا آگے رہا لیکن واپسی پر افضل اس سے آملا۔ چودھری رمضان پہلے کی طرح اب بھی یہ پیش گوئی کر چکا تھا کہ شیر سنگھ کا گھوڑا جیتے گا ہری سنگھ لوہار اور کاکو عیسائی نے بھی اپنی پگڑی کی شرط لگائی تھی کاکو عیسائی نے دعویٰ کیا تھا کہ افضل کی گھوڑی جیتے گی اور ہری سنگھ لوہار نے دعویٰ کیا تھا

کہ شیر سنگھ کا گھوڑا جیتے گا۔

درخت کی طرف جاتے ہوئے جب شیر سنگھ کا گھوڑا آگے نکل گیا تو ہری سنگھ لوہار چلایا ''او کاکو کے بچے لاؤ پگڑی'' کاکو نے چپکے سے اپنی پگڑی اتار کر اس کے ہاتھ میں دے دی لیکن جب واپسی پر دونوں برابر ہو گئے اور پھر تھوڑی دیر بعد افضل کی گھوڑی آگے نکلنے لگی تو کاکو نے کہا ''او ہری سنگھ جلدی کر، اپنی پگڑی اتار!''

ہری سنگھ نے کہا ''ارے ابھی وہ پانچ چھ کھیت دور ہیں شیر سنگھ ضرور آگے نکلے گا۔''

''تو نے دوڑ ختم ہونے کا انتظار کرنے سے پہلے میری پگڑی اتروالی تھی، اب اتار اپنی پگڑی ورنہ میں خود اتار لوں گا!''

کاکو نے ہری سنگھ کے جواب کا انتظار نہ کیا اس نے ایک ہاتھ سے اپنی پگڑی چھینتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے ہری سنگھ کی پگڑی اتار لی ایسے معاملات میں ہری سنگھ کو کاکو کی جسمانی طاقت لالحاظ کرنا پڑتا تھا۔

دوڑ ختم کرنے سے پہلے افضل شیر سنگھ سے ایک کھیت آگے نکل چکا تھا۔ اندر سنگھ غصے اور ندامت کی حالت میں اٹھ کر گھر کی طرف چل دیا۔ شیر سنگھ کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ اس نے افضل کے قریب پہنچ کر اپنا گھوڑا روکا اور اپنی پگڑی اتارنے کے لیے سر کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ لیکن افضل نے کہا ''شیر سنگھ اپنی پگڑی اپنے سر پر رہنے دو کسی کی پگڑی اتروانا بہادروں کا کام نہیں۔''

چودھری رحمت علی نے آگے بڑھتے ہوئے کہا ''ٹھیک ہے بیٹا! اپنی پگڑی نہ

اتارو تمہارے باپ نے مجبور کیا تھا ورنہ شرط لگانا عقل مندوں کا کام نہیں۔"

لیکن شیر سنگھ نے اپنی پگڑی اتار کر افضل کی طرف پھینک دی اور گھوڑی کو ایڑ لگا دی۔

اسماعیل نے آگے بڑھ کر چودھری رمضان کی چلم اتاری اور اسے اطمینان سے زمین پر رکھ کر لاٹھی اٹھاتے ہوئے کہا "چودھری رمضان! میں نے اپنے دل میں ایک شرط لگائی تھی اور وہ یہ کہ اگر شیر سنگھ کا گھوڑا آگے نکل گیا تو میں تمہارا حقہ توڑ ڈالوں گا اور اگر ہماری گھوڑی آگے نکل گئی تو صرف تمہارے حقے کی چلم توڑ دوں گا خدا کا شکر کرو کہ تم بڑے نقصان سے بچ گئے ہو۔"

رمضان چلایا "ارے ایسا نہ کرنا میں کل ہی لایا تھا"

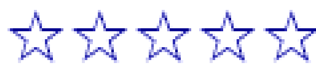
اس نے آگے بڑھ کر چلم چھیننے کی کوشش کی لیکن اسماعیل کی لاٹھی اپنا کام کر چکی تھی۔ ہری سنگھ لوہار کے لیے اس گھوڑ دوڑ کا نتیجہ کچھ کم پریشانی کا باعث نہ تھا۔ کاکو عیسائی اپنے سر پر اس کی پگڑی باندھ کر لوگوں کو دکھا رہا تھا۔ مردوں کی تو خیر اور بات تھی لیکن تھوڑی دیر میں یہ معاملہ گاؤں کی عورتوں تک پہنچنے والا تھا۔ ہری سنگھ کو اس بات میں ذرہ بھر شبہ نہ تھا کہ کاکو لڑکوں کا جلوس اپنے پیچھے لگا کر سارے گاؤں میں پھرے گا وہ اپنی زندگی کے اس دن کو بہت منحوس سمجھتا تھا جب اس نے کاکو کے ساتھ مذاق شروع کیا تھا۔ کاکو نے اسے بار بار نیچا دکھایا تھا ایک دفعہ اس نے تنگ آ کر اپنے کتے کا نام کاکو رکھ دیا تھا جب کاکو اس کی بھٹی کے سامنے سے گزرتا تو وہ اپنے کتے کو آواز دیتا "کاکو! کاکو! کاکو! توے توے توے"

ہری سنگھ کے باپ کا نام سنتو تھا اور کاکو نے ایک بھینسا پال رکھا تھا، اس نے چند دن کے غور و فکر کے بعد اس بھینسے کا نام سنتو رکھ دیا جب کبھی ہری سنگھ اس کے پاس سے گزرتا تو وہ فوراً اٹھ کر اپنے بھینسے کو ڈنڈے مارتے ہوئے کہتا ''او سنتو تو مر جائیں تینوں بوچڑ لے جان او سنتو۔۔۔'' اور وہ سنتو کو ایسی گالیاں دیتا جو ہری سنگھ کے لیے ناقابل برداشت ہوتیں۔ ہری سنگھ نے اس کے گھر کے قریب سے گزرنا ترک کر دیا لیکن کاکو اس کا پیچھا چھوڑنے کے لیے تیار نہ تھا وہ دن میں ایک آدھ بار کسی نہ کسی بہانے اپنے بھینسے کا رسا پکڑ کر اس کی بھٹی کے سامنے سے گزرتا اور اسے سنتو کے نام سے نئی نئی گالیاں دیتا۔

گاؤں کے لڑکے اس کے گرد جمع ہو کر پوچھتے ''کاکو! سنتو کو آج کہاں لے جا رہے ہو؟''

اور وہ جواب دیتا ''بوچڑ خانے لے جا رہا ہوں'' ہری سنگھ دانت پیس کر رہ جاتا۔

بالآخر ہری سنگھ نے کتے کو گھر سے نکال دیا اور کاکو نے اپنے بھینسے کا نام تبدیل کر لیا۔



گھوڑ دوڑ سے چند روز بعد ایک دن ہری سنگھ ہل کی پھالی بنا رہا تھا۔ شیر سنگھ اس کے قریب بیٹھا ہوا تھا افضل آیا اور اس نے کہا ''ہری سنگھ! کل میں نے اپنی گھوڑی کی

زنجیر کی چابی اس کے قفل میں ہی رہنے دی۔۔۔۔۔شاید کسی بچے نے گم کر دی ہے۔میں تمہیں زنجیر لا دیتا ہوں، اس کے لیے نئی چابی بنا دو‘‘

’’اچھا بنا دیتا ہوں لیکن چابی کا خیال رکھا کرو کسی برے آدمی کے ہاتھ لگ گئی تو کہیں گھوڑی نہ لے اڑے پرسوں سردار چرن سنگھ کی گھوڑی چوری ہو گئی ہے۔اس کے پاؤں میں زنجیر بندھی ہوئی تھی لیکن چور نے چابی لگا کر کھول لی۔‘‘

افضل نے کہا’’اس زنجیر کے تالے بھی کچھ اچھے نہیں میرا خیال ہے کہ کسی دن شہر جا کر کوئی مضبوط سی زنجیر لے آؤں لیکن ابھی تم اس کی چابی بنا دو‘‘

افضل چلا گیا تو تھوڑی دیر بعد کالو وہاں سے گزرا، اس کے سر پر وہی پگڑی تھی جو اس نے ہری سنگھ سے شرط میں جیتی تھی۔

ہری سنگھ نے شیر سنگھ سے کہا’’میں نے سنا ہے کہ افضل نے تمہاری پگڑی تمہارے گھر بھیج دی ہے لیکن یہ کالو بڑا بدمعاش ہے یہ روز میری پگڑی دکھانے کے لیے ادھر سے گزرتا ہے۔‘‘

شیر سنگھ نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا’’ہری سنگھ اگر تم بیس روپے کمانا چاہتے ہو تو میرے ساتھ ایک سودا کر لو‘‘

بیس روپے کا نام سن کر ہری سنگھ کا ہتھوڑا رک گیا۔اس نے کچھ سوچ کر کہا’’اگر تم میری گائے خریدنا چاہتے ہو تو میں تیس سے ایک کوڑی کم نہیں لوں گا۔‘‘

شیر سنگھ نے کہا’’نہیں بیس روپے میں تمہیں ایسی چیز کے دوں گا جس کی قیمت دو پیسے سے زیادہ نہیں ہو گی۔‘‘

''تم مذاق کرتے ہو؟''

''میں مذاق نہیں کرتا''

''اچھا بتاؤ کیا چیز ہے وہ؟''

''پہلے قسم کھاؤ تم کسی سے اس بات کا ذکر نہیں کرو گے!''

''میں باپو کی قسم کھاتا ہوں''

''نہیں گورو گرنتھ کی قسم کھاؤ!''

ہری سنگھ نے دو پیسے کی چیز بیس روپے کے عوض فروخت کرنے کے لالچ میں قسم کھالی،تو شیر سنگھ نے کہا''افضل کی گھوڑی کی زنجیر کی ایک چابی مجھے بنادو۔''

ہری سنگھ تھوڑی دیر کے لیے سکتے میں آگیا اس نے کہا''تم۔۔۔۔؟''

''ہاں! میں اس گھوڑی کو دریا کے پار پہنچانا چاہتا ہوں''

ہری سنگھ نے تھوڑی دیر سوچنے کے بعد کہا''لیکن اگر تم پکڑے گئے تو میں بھی تمہارے ساتھ پھنس جاؤں گا''

شیر سنگھ نے کہا''میں قسم کھاتا ہوں کہ میں تمہارا نام کسی کو نہیں بتاؤں گا''

ہری سنگھ نے کہا''چوری پاپ ہے''

''تمہیں اس سے کیا تم مجھے چابی بنادو''

ہری سنگھ نے کسی طرح اپنے ضمیر کی رضامندی حاصل کر لی تاہم اس نے کہا''جب تم گھوڑی لے کر کہیں جاؤ گے تو تمہیں گاؤں میں نہ پا کر وہ تم پر شک کریں گے''

''تم فکر نہ کرو میرا کام گھوڑی کو ان کی حویلی سے باہر نکالنا ہو گا۔اسے لیجانے

والے یہاں موجود ہوں گے۔"

"اچھا تم جاؤ۔ افضل تمہیں میرے پاس بیٹھا دیکھ کر شک کرے گا میں پھالی کے ساتھ چابی بھی تمہارے گھر پہنچا دوں گا۔"

"لیکن چابی صرف مجھے دینا میرے باپو کو بھی نہ بتانا"

"اور پیسے کب ملیں گے؟"

شیر سنگھ نے اٹھتے ہوئے جواب دیا "جس دن گھوڑی نکل جائے گی۔"



رات کے دو بجے موسلا دھار بارش ہو رہی تھی شیر سنگھ بیرونی دیوار پھاند کر حویلی کے اندر داخل ہوا اس نے دبے پاؤں پھاٹک کی طرف چلتے ہوئے اپنی جیب سے چابیوں کا ایک گچھا نکالا اور کنڈی ٹٹولنے لگا وہ ابھی تاریکی میں ہاتھ مار رہا تھا کہ بجلی چمکی اور وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ کنڈی میں تالا نہیں تھا۔

دو دن پہلے بھی اس نے قسمت آزمائی کی تھی لیکن پھاٹک کے اندر کی طرف کنڈی میں تالا لگا ہوا تھا اور اسے مایوس ہو کر لوٹنا پڑا تھا آج ہری سنگھ لوہار اور رام سنگھ ڈاکو نے اسے پندرہ بیس چابیاں مہیا کر دی تھیں۔ لیکن کنڈی کا تالا غائب تھا اس نے سوچا شاید گھر کے آدمی تالا لگانا بھول گئے ہوں اور ادھر ادھر دیکھ کر آہستہ سے کنڈی کھول دی لیکن دروازے کو اسی طرح بند رہنے دیا اور دبے پاؤں چلتا ہوا مویشی خانے میں داخل ہوا بجلی کی چمک میں وہ حویلی کے دوسرے سرے پر

برآمدے میں سونے والے آدمیوں کی چارپائیاں دیکھ چکا تھا لیکن بارش کی تیزی کے باعث اسے اطمینان تھا کہ وہاں اگر کوئی جاگ بھی رہا ہو تو صحن کے دوسرے سرے پر معمولی آہٹ اس کے کانوں تک نہیں پہنچ سکے گی تاہم اس کا دل دھڑک رہا تھا۔

کچھ دیر تذبذب کی حالت میں مویشی خانے کے دروازے کی اوٹ میں کھڑا رہا۔اس نے اپنی لاٹھی دروازے کے ساتھ لگا کر رکھ دی، جیب میں ہاتھ ڈال کر گھوڑی کے پاؤں کی زنجیر کی چابی نکالی اور چابیوں کا بڑا گچھا وہیں ڈال دیا۔

بجلی کی ایک اور چمک کے بعد وہ اپنے گردوپیش کا جائزہ لے کر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔کھونٹے سے گھوڑی کی گردن کا رسا کھولنے کے بعد وہ بیٹھ کر گھوڑی کے پاؤں کی زنجیر کھولنے لگا اندھیرے میں اس نے انگلیوں سے ٹٹول کر تالے کا سوراخ تلاش کیا۔اس کے دل کی دھڑکن لحظہ بہ لحظہ تیز ہو رہی تھی اور اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے بارش کے باعث موسم میں کافی حد تک اعتدال آ چکا تھا تاہم اسے پسینہ آ رہا تھا اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ایک طرف کا تالا کھولا۔گھوڑی کے دوسرے پاؤں تک ہاتھ لے جانے کے لیے وہ دونوں گھٹنے زمین پر ٹیک کر آگے بڑھا وہ دوسرے تالے کا سوراخ ٹٹول رہا تھا کہ گھوڑی نے اچانک گردن ہلائی اور ایک سم زمین پر مارتے ہوئے نتھنوں سے ”کھر رکھر ر“ کی آواز نکالنے لگی۔

شیر سنگھ نے گھوڑی کے گلے کا رسہ اپنی بغل میں لے لیا اور اسے چمکارنے اور اس کی گردن پر ہاتھ پھیرنے کے بعد پھر اسی طرح بیٹھ کر تالا کھولنے میں مصروف ہو

گیا وہ چابی تالے کے سوراخ میں ڈال کر گھما رہا تھا کہ اسے اپنے قریب ہلکی سی آہٹ محسوس ہوئی اس نے جلدی سے اٹھنے کی کوشش کی لیکن اس کی چادر کا ایک کونہ گھوڑی کے پاؤں کے نیچے آچکا تھا۔اس نے گھوڑی کو پیچھے ہٹا کر اس کے سم کے نیچے سے اپنی چادر نکالنے کی کوشش کی لیکن کسی کا ایک ہاتھ اس کی گردن پر تھا اور دوسرا ہاتھ اس کے بازو پر شیر سنگھ کے بدن میں خون کا ہر قطرہ منجمد ہو کر رہ گیا ایک ثانیہ کے بعد اس نے اپنی بدحواسی پر قابو پا کر اٹھنے کی کوشش کی لیکن اس نے محسوس کیا کہ اس آہنی گرفت سے آزاد ہونا ممکن نہیں پہلا خیال جو اس کے دماغ میں آیا، یہ تھا کہ حملہ آور افضل کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا۔حملہ آور نے اچانک اس کی گردن چھوڑ کر دونوں ہاتھوں سے اس کی کلائی پکڑ لی اور مروڑ کر اس کی پیٹھ کے ساتھ لگا دی۔ شیر سنگھ نے محسوس کیا کہ اگر اس نے ذرا اور زور دیا تو اس کا بازو ٹوٹ کر اس کے کندھے سے الگ ہو جائے گا پکڑنے والے نے اپنی جسمانی برتری کا ایک ثبوت دینے کے لیے اس کی کلائی چھوڑ دی اور اچانک اس کی کمر میں بازو ڈال کر اسے اوپر اٹھایا اور اچھال کر کھرلی میں پھینک دیا اور پیشتر اس کے کہ شیر سنگھ اٹھ کر بیٹھتا۔حملہ آور اس کے سینے پر سوار ہو چکا تھا۔

''میں تمہارا دو راتوں سے انتظار کر رہا تھا، تم اب نہیں جا سکتے!'' یہ افضل کی آواز تھی جس میں غصے یا اضطراب سے کہیں زیادہ خود اعتمادی تھی وہ خود اعتمادی جس کی بدولت مرد شیر کے گلے میں دستا ڈال دیتے ہیں۔

شیر سنگھ کو پہلی بار بزرگوں کے اس قول کی صداقت کا اعتراف کرنا پڑا کہ چور کے

پہلو میں دل نہیں ہوتا۔وہ محسوس کر رہا تھا کہ اگر افضل کے سامنے اس کی حیثیت ایک چور کی نہ ہوتی تو وہ اس قدر بودا ثابت نہ ہوتا۔وہ اپنی قوت مدافعت کو اس حویلی کی چار دیواری سے باہر چھوڑ آیا تھا۔اس نے یہ بھی محسوس کیا کہ اگر افضل دوراتوں سے اس کا انتظام کر رہا تھا تو اس کے تمام انتظامات مکمل ہوں گے اس لیے جدوجہد فضول ہے اور افضل جیسے اس کے دل کی آواز سن رہا تھا وہ بولا''اگر بھاگنے کی کوشش کرو گے تو تم دیکھو گے کہ میرے ہاتھ بہت بے رحم ہیں لیکن تم میں تھوڑی بہت سمجھ ضرور ہوگی اچھا بتاؤ تم ہو کون؟''

شیر سنگھ خاموش رہا افضل نے اس کی پگڑی اتار کر اس کی ٹانگیں باندھ دیں اور پھر اسے الٹا کر کے اس کے دونوں ہاتھ پیچھے کی طرف باندھ دیے اس کام سے فارغ ہو کر وہ گھوڑی کی طرف متوجہ ہوا۔اس نے جھک کر گھوڑی کے پاؤں کی زنجیر ٹٹولی اور بولا''اوہو!تم تو اپنا کام ختم کر چکے تھے خیر اب یہ زنجیر تمہارے کام آئیگی۔''

افضل نے زنجیر اٹھا کر اس کے پاؤں میں ڈال دی اور اسے کھرلی میں سیدھا لٹاتے ہوئے کہا''دیکھو میں شور مچا کر گھر کے آدمیوں کو پریشان نہیں کرنا چاہتا اب سیدھی طرح میری باتوں کا جواب دو تم کس گاؤں سے آئے ہو اور تمہارے ساتھی کون کون ہیں؟''

شیر سنگھ نے کوئی جواب نہ دیا۔

افضل نے پھر کہا''میں یہ سمجھتا ہوں کہ تم اکیلے یہاں تک نہیں پہنچے ہمارے گاؤں سے کوئی تمہیں راستہ دکھانے والا ضرور ہے میں تمہیں چھوڑ سکتا ہوں لیکن

اپنے گاؤں کے بدمعاش کو نہیں چھوڑوں گا اگر وہ کسی جگہ باہر تمہارا انتظار کر رہا ہے تو مجھے بتاؤ!''

شیر سنگھ نے پھر کوئی جواب نہ دیا۔

باہر بجلی چمکی دروازے کے راستے آنے والی روشنی میں افضل کو شیر سنگھ کے چہرے کی ہلکی سی جھلک دکھائی دی اور وہ چلا اٹھا ''شیر سنگھ!''

چور اس پر بھی خاموش رہا افضل بھاگتا ہوا باہر نکلا تھوڑی دیر میں وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں لالٹین تھی چند لمحے وہ خاموشی کی حالت میں شیر سنگھ کی طرف دیکھتا رہا پھر اس نے لالٹین دیوار کے ساتھ لٹکا دی اور کھرلی پر ایک پاؤں رکھ کر اس کی طرف دیکھنے لگا شیر سنگھ بدترین سزا کے لیے تیار ہو چکا تھا لیکن افضل کی خاموشی اس کے لیے صبر آزما تھی بالآخر افضل بولا ''تو پرسوں بھی تم ہی نے ہماری دیوار پھاندی تھی، اگر میں دیوار پر اکھڑی ہوئی مٹی اور نیچے دونوں طرف پاؤں کے نشان نہ دیکھتا تو تم اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے ہوتے۔ اس دن شاید تم پھاٹک کی کنڈی میں تالا دیکھ کر واپس چلے گئے تھے میں نے کل رات تالا اتار لیا تھا۔ لیکن کل تم نہ آئے میں سمجھ گیا تھا چور ایک رات جاگنے کے بعد اگلی رات کو آرام کرتا ہے مجھے یقین تھا کہ آج تم ضرور آؤ گے۔۔۔ لیکن مجھے تم پر رحم آتا ہے گھوڑ دوڑ میں ہار جانا اس قدر شرمناک بات نہ تھی کہ تم چوری پر اتر آتے تمہاری صورت چوروں جیسی نہیں اگر آج تم چوری کرنے میں کامیاب ہو جاتے تو کل کسی کے گھر ڈاکہ ڈالتے، اس کے بعد کسی کو قتل کرتے اور کسی دن دنیا تمہیں پھانسی پر لٹکتا ہوا دیکھتی شیر سنگھ تمہارا باپ ہمارا

دشمن ہے لیکن وہ بہادر ہے اور ایک بہادر آدمی یہ سننا پسند نہیں کرے گا کہ اس کا بیٹا چور ہے۔''

الفاظ کے یہ میٹھے مگر جگر دوز نشتر شیر سنگھ کے لیے نا قابل برداشت تھے اس نے کہا ''افضل! اب باتوں سے اپنے دل کی بھڑاس نہ نکالو۔ دروازے کے پاس میری لاٹھی پڑی ہوئی ہے وہ اٹھا لو اب اگر تم مجھے مار بھی ڈالو تو پولیس والے تمہیں نہیں پکڑیں گے میں تمہارا چور ہوں اگر تم میں لاٹھی اٹھانے کی ہمت نہیں تو اپنے آدمیوں کو بلاؤ تمہاری آواز سن کر گاؤں جمع ہو جائے گا اور اگر میرا باپو مجھے اس حال میں دیکھ لے تو وہ بھی یہی کہے گا کہ اس نے میرے منہ پر سیاہی ملی ہے، اسے مار ڈالو''

افضل نے کہا ''آہستہ بات کرو سامنے برآمدے میں میرے بھائی اور نوکر سو رہے ہیں۔''

''تو تم مجھے ترسا ترسا کر مارنا چاہتے ہو اگر تم انہیں نہیں بلاؤ گے تو میں انہیں آواز دوں گا۔''

افضل نے کہا ''شیر سنگھ تم میرے ہاتھ دیکھ چکے ہو میں آسانی سے تمہارا گلا گھونٹ سکتا ہوں۔ میری مرضی کے بغیر تمہاری آواز تمہارے ہونٹوں سے باہر نہیں آ سکتی۔''

افضل نے یہ الفاظ کچھ اس انداز سے کہے کہ شیر سنگھ نے اپنے جسم میں ایک کپکپی سی محسوس کی۔

دونوں تھوڑی دیر خاموشی کی حالت میں ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔

افضل اچانک تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا باہر نکل گیا۔ جب وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھوں میں گھوڑی کی زین اور لگام تھی۔ اس نے اطمینان سے گھوڑی کی پیٹھ پر زین رکھ کر اسے لگام دی اور پھر زین کستے ہوئے بولا "شیر سنگھ! تم نے کسی آدمی کو پھانسی پر لٹکتے ہوئے نہیں دیکھا میں نے بھی نہیں دیکھا لیکن بھائی کے ساتھ جا کر دلاور علی ڈاکو کی لاش دیکھی تھی۔ پھانسی کے بعد اس کی زبان منہ سے بالشت بھر باہر آ چکی تھی۔ اس کی آنکھیں بھی باہر آ چکی تھیں، اور اس کی گردن! توبہ میری توبہ! میں اپنی زندگی میں کبھی نہیں ڈرا لیکن اسے دیکھ کر ڈر گیا تھا کہتے ہیں کہ وہ پہلے چوری کرنے کے جرم میں ایک سال کے لیے قید ہوا تھا جیل سے رہا ہونے کے بعد وہ ڈاکو بن گیا۔ پھر اسے سات سال کی سزا ہوئی دوسری بار رہا ہونے کے بعد اس کا دل بڑھ چکا تھا اور اس نے تین آدمیوں کو قتل کر دیا پھر اسے پھانسی کی سزا ہوئی" افضل زین کسنے کے بعد گھوڑی کا رسا کھول کر اس کی گردن کے ساتھ لپیٹ رہا تھا۔

شیر سنگھ نے کہا "تم تھانے جا رہے ہو؟"

افضل نے اطمینان کے ساتھ جواب دیا "نہیں میں یہ نہیں چاہتا کہ دلاور علی کی طرح تمہاری گردن بھی کسی دن پھانسی کے پھندے تک پہنچ جائے میں نے اس کی ماں اور بیوی کو روتے دیکھا تھا میں نہیں چاہتا کہ میں تمہارے ماں باپ کو بھی اسی طرح روتا ہوا دیکھوں۔ میرے لیے یہ زیادہ آسان ہے کہ میں تمہارے دونوں بازو توڑ ڈالوں، تاکہ تم پھر کسی کی دیوار نہ پھاند سکو۔ لیکن میں نے سنا ہے کہ اگلے مہینے تمہاری شادی ہونے والی ہے، شیر سنگھ! اگر میں تمہیں آج چھوڑ دوں تو پھر بھی تم چوری کرو

گے؟''

شیر سنگھ کی خاموشی پر افضل نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور کہا ''تمہیں میری بات پر یقین نہیں آتا ٹھہرو!'' یہ کہتے ہوئے افضل نے اس کے ہاتھ پاؤں زنجیر اور پگڑی کی گرفت سے آزاد کر دیے شیر سنگھ حیرت زدہ ہو کر اس کی طرف دیکھ رہا تھا افضل نے کہا ''اٹھو!''

وہ غیر ارادی طور پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔

افضل نے پھر کہا ''تم اس گھوڑی کے لیے آئے تھے، یہ اب تمہاری ہے اب تم اس پر سوار ہو کر جاؤ گے لیکن اس شرط پر کہ یہ گھوڑی تم اپنے پاس رکھو گے، کسی ڈاکو کے حوالے نہیں کرو گے۔''

شیر سنگھ کو یقین تھا کہ اب اچانک افضل ایک قہقہہ لگائے گا اور اس کی چھاتی پر چڑھ جائے گا۔

افضل نے کہا ''تم سوچ رہے ہو کہ جب تم باہر نکلو گے تو میرے آدمی تم پر ڈٹ پڑیں گے۔۔۔تم شاید یہ بھی سوچتے ہو گے کہ ابا کی اجازت کے بغیر میں تمہیں یہ گھوڑی نہیں دے سکتا تم بہت بے وقوف ہو، شیر سنگھ یہ گھوڑی میری ہے اور میں تم جیسے نوجوان کو پھانسی سے بچانے کے لیے یہ گھوڑی دے سکتا ہوں میں کہوں گا کہ میں نے اسے تمہارے ہاتھ بیچ دیا ہے۔ اپنی پگڑی باندھو اور میرے ساتھ آؤ صبح ہونے والی ہے جلدی کرو!''

شیر سنگھ جلدی سے پگڑی اپنے سر پر لپیٹ کر کھڑا ہو گیا۔ افضل نے ایک ہاتھ

سے گھوڑی کی باگ پکڑ لی اور دوسرے ہاتھ سے شیر سنگھ کا بازو پکڑ کر باہر نکل آیا بارش کا زور اسی طرح تھا اور صحن پانی سے بھرا ہوا تھا پھاٹک کے قریب پہنچ کر افضل نے اس کا بازو چھوڑ دیا اور کہا ''دروازہ کھولو!''

شیر سنگھ نے قدرے تذبذب کے بعد دروازہ کھول دیا

پھاٹک سے باہر نکل کر افضل نے گھوڑی کی باگ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا ''لو اب سوار ہو جاؤ!''

بجلی چمکی، شیر سنگھ نے افضل کا چہرہ دیکھا مسکراتا ہوا دلفریب چہرہ، اس کے توہمات مٹ چکے تھے ''افضل سچ مچ؟''

شیر سنگھ کی آواز اس کے حلق میں دب کر رہ گئی۔۔۔۔۔وہ افضل کے پاؤں پر گر پڑا۔وہ سسکیاں لے رہا تھا وہ رو رہا تھا ایک بچے کی طرح ''افضل! افضل! مجھے معاف کر دو نہیں نہیں، مجھے مار ڈالو، مجھے مار ڈالو!''

افضل نے اسے بازو سے پکڑ کر اٹھایا اور کہا ''میں تمہیں معاف کر چکا ہوں شیر سنگھ اور اسکے ثبوت میں میں تمہیں یہ گھوڑی دے رہا ہوں۔''

''بھگوان کے لیے اس گھوڑی کا نام نہ لو اس سے پہلے میں انسان نہیں تھا لیکن حیوان بھی نہیں ہوں مجھے اس بدمعاش نے ورغلایا تھا وہ روز میرے پاس آتا تھا۔''

افضل نے پوچھا ''کون ہے وہ؟''

''امر سنگھ ڈاکو''

''کہاں ہے وہ؟''

''وہ ہماری حویلی کے دروازے پر میرا انتظار کر رہا ہوگا''

افضل نے کہا ''میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں''

''نہیں، یہ میرا اور اس کا معاملہ ہے!'' یہ کہہ کر شیر سنگھ افضل کے جواب کا انتظار کیے بغیر بھاگ گیا۔



افضل نے گھوڑی کو پھر اصطبل میں باندھ دیا اور پانی میں بھیگے ہوئے کپڑے بدل کر چارپائی پر لیٹ گیا صبح کی روشنی نمودار ہو رہی تھی وہ اونگھ رہا تھا کہ گاؤں کے دوسرے سرے پر لوگوں کی چیخ و پکار سنائی دی۔ وہ جلدی سے اٹھا اور حویلی سے باہر نکل آیا اب بہت سے آدمیوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں جب افضل شیر سنگھ کی حویلی کے قریب پہنچا تو اسے چودھری رمضان واپس آتا ہوا ملا۔

افضل نے سوال کیا ''کیا ہوا چودھری؟''

''حد ہوگئی'' رمضان نے جواب دیا

''کیا ہوا آخر؟''

''چودھری افضل! اندر سنگھ کے لڑکے نے حد کر دی''

''ارے بتاؤ بھی؟''

''تم نے پار والے امر سنگھ ڈاکو کا نام سنا ہے؟''

''ہاں کیا ہوا اسے؟''

''شیر سنگھ نے اس کے دونوں بازو توڑ دیے ہیں''

''سچ!''

''خدا کی قسم! شیر سنگھ سورما ہے پتہ ہے اس نے امر سنگھ کے بازو کس طرح توڑے ہیں؟''

''کس طرح توڑے ہیں؟''

''مروڑ کر لوگوں نے بڑی مشکل سے اس کی جان چھڑائی ہے یہ بہت اچھا ہوا اس نے کچھ دنوں سے اندر سنگھ کے گھر میں ٹھکانا بنا رکھا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ کوئی واردات ضرور ہو گی لیکن اب وہ اس گاؤں کا رخ نہیں کرے گا۔''

رمضان اور افضل باتیں کر رہے تھے کہ شیر سنگھ کی حویلی میں پھر شور سنائی دیا۔

افضل نے کہا ''اب کیا ہو رہا ہے؟''

رمضان نے جواب دیا ''اب لوگ یونہی شور مچا رہے ہیں امر سنگھ تو بازو تڑوا کر جا چکا ہے۔''

''نہیں، شاید کسی کو مار پڑ رہی ہے''

رمضان نے کہا ''نہیں وہ ہنس رہے ہیں چلو مجھے تو بارش میں سردی لگ رہی ہے''

افضل اور رمضان وہاں سے کھسکنے کو تھے کہ کاکو عیسائی بھاگتا ہوا آیا وہ ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔

''کیا ہے کاکو؟'' افضل نے سوال کیا

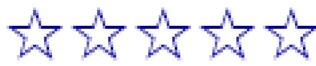
اس نے جواب دیا ''چودھری جی آج مزا آ گیا سالا ہری سنگھ بھی کیا یاد کرے گا''

''آخر کیا ہوا؟''

''شیر سنگھ نے ہری سنگھ کے سر پر گن کے بیس جوتے مارے ہیں''

''ارے وہ کیوں؟''

''پتہ نہیں اس کی قسمت ہی ایسی ہے لوگ اس کی حویلی میں جمع ہو رہے تھے وہ بھی معتبری دکھانے کے لیے وہاں آ گیا شیر سنگھ کو اس کی شکل دیکھتے ہی غصہ آ گیا اس نے کہا ''ہریا! آ و تمہیں بیس روپے دوں'' یہ کہتے ہی اس نے جوتا اتار لیا اور ہری سنگھ کو بالوں سے پکڑ کر کیچڑ میں بٹھا لیا۔ اس نے بہتیرا شور مچایا۔ لوگوں نے بھی چھڑانے کی کوشش کی لیکن اس نے بیس جوتے لگا کر ہی چھوڑا اور خدا کی قسم بارش اور کیچڑ کی وجہ سے اس کے جوتے کا وزن دو سیر سے کم نہ تھا۔''



جو کچھ افضل کی حویلی میں ہوا تھا، اس کا دو آدمیوں کے سوا کسی کو علم نہ تھا۔ لیکن شیر سنگھ کے ہاتھوں علاقے کے مشہور و معروف ڈاکو کا پٹنا اور ہری سنگھ کا جوتے کھانا گاؤں کے لوگوں کے لیے معمولی واقعات نہ تھے ایسے حادثات کے بعد گاؤں کے لوگ بھگت رام کی دکان یا چودھری رحمت علی کی حویلی کے سامنے بڑ کے درخت کے نیچے جمع ہو کر تبصرے اور قیاس آرائیاں کیا کرتے تھے کوئی درخت کے نیچے چبوترے پر اپنی چادر بچھا کر بیٹھ جاتا اور کوئی اپنی چارپائی اٹھا لاتا۔ سردیوں کے دنوں میں ایسی

محفلیں سائیں اللہ رکھا کے تکیے میں منعقد ہوتیں گاؤں کی ہر محفل اسماعیل کے بغیر نا مکمل سمجھی جاتی اگر وہ خاموش ہو جاتا تو لوگ سمجھتے کہ اسے کوئی نئی تدبیر سوجھ رہی ہے اور جب وہ اچانک گردن اٹھا کر کسی کی طرف دیکھ کر مسکراتا تو لوگ سمجھ جاتے کہ اب کسی کی شامت آنے والی ہے ادھر اس کی زبان ہلتی ادھر لوگوں کے قہقہے بلند ہونے لگتے۔ لچھمن سنگھ کو ذرا اونچا سنائی دیتا تھا وہ عام طور پر اس کے قریب بیٹھتا لیکن اس کے باوجود جب کبھی اسماعیل کی آواز اس کے کانوں تک نہ پہنچتی تو وہ بھی قہقہہ لگانے میں دریغ نہ کرتا۔ جب لوگ خاموش ہو جاتے تو وہ کسی سے سرگوشی کے انداز میں کہتا۔ ”کیا کہا اسماعیل نے؟“ لوگ اسے بلند آواز میں سمجھاتے اور اسے دوسرا قہقہہ لگانا پڑتا۔

اسماعیل گاؤں کے لیے ایک دائمی مسکراہٹ اور ایک مسلسل قہقہہ تھا لیکن چودھری رمضان اس سے بے حد نالاں تھے جب اسماعیل کو کوئی نہ سوجھتی تو اس کی توجہ چودھری رمضان پر مبذول ہو جاتی وہ ایسے موقعوں پر انتہائی دانشمندی سے لیتا لیکن اس کے منہ سے جو بھی بات نکلتی، اسماعیل اسے اہل محفل کے قہقہوں کا موضوع بنا دیتا۔ بارہا چودھری رمضان نے اپنے دل میں عہد کیا کہ وہ اسماعیل کے قریب نہیں بیٹھے گا لیکن لوگوں کے قہقہے اس کے لیے صبر آزما ثابت ہوتے اور اسے اپنے ارادوں کے خلاف گھر سے نکل کر محفل میں شریک ہونا پڑتا کبھی کبھی وہ گھر میں بیٹھ کر حقے سے دل بہلانے کی کوشش کرتا لیکن لوگ اپنی محفل میں اس کی کمی محسوس کرتے اور کوئی نہ کوئی اسے بلانے کے لیے آجاتا۔

آج اگر بارش کا زور نہ ہوتا تو گاؤں کے بڑے بوڑھے یقیناً بڑ کے بڑے درخت کے نیچے جمع ہو جاتے اور اسماعیل اپنے مخصوص انداز میں یہ معما حل کرتا کہ شیر سنگھ نے ہری سنگھ کے سر پر بیس جوتے کیوں مارے رمضان اور کاکو کسی نہ کسی بہانے ہری سنگھ کو اٹھا کر محفل میں لے آتے لیکن بارش جو صبح کے وقت قدرے کم ہو گئی تھی، اب پھر زوروں پر تھی گاؤں کے ایک جوہڑ کا پانی بڑ کے درخت کے نیچے مٹی کے چبوترے تک اور دوسرے جوہڑ کا پانی عیسائیوں کے گھروں تک پہنچ چکا تھا چودھری رمضان کا صحن پانی میں ڈوبا ہوا تھا اس کی حویلی کی ایک دیوار گر گئی اور اس کا ایک بھینسا نیچے دب گیا اور وہ چلا رہا تھا کہ کچھمن سنگھ اور اس کے ساتھ دیوار کو پیچھے سے دھکا دے کر گرا گئے ہیں۔

لوگوں کو اپنے گھروں اور کھیتوں کی فکر تھی اس لیے وہ سب کسی جگہ جمع ہو کر تازہ واقعات پر اسماعیل کا تبصرہ نہ سن سکے۔

صرف آٹھ دس آدمی مویشیوں والی حویلی کے برآمدے میں اسماعیل کے گرد جمع ہو کر گپیں ہانک رہے تھے بارش کی رفتار کے ساتھ سیلاب کا خطرہ بڑھ رہا تھا اسماعیل حسب معمول قہقہے لگا رہا تھا آج اس کے ساتھ افضل بھی ہنس رہا تھا لیکن اس کی ہنسی کی وجہ کچھ اور تھی

چودھری رحمت علی سر پر چھتری تانے گھر کی ڈیوڑھی سے نکل کر برآمدے میں داخل ہوا اور بولا ”تم یہاں کیا کر رہے ہو اگر سیلاب کے پانی نے کھیتوں کا رخ کر لیا تو مکئی اور ماش کی فصل تباہ ہو جائے گی جاؤ دیکھو کوئی نالے کا بند ہی نہ توڑ دے!“

غلام حیدر نے کہا ''میں ابھی چکر لگا کر آیا ہوں''

چودھری رمضان شور مچاتا ہوا حویلی میں داخل ہوا صحن میں اس کا پاؤں پھسلا اور وہ کیچڑ اور پانی میں لت پت ہو گیا اسماعیل نے قہقہہ لگایا اور باقی سب نے اس کی تقلید کی۔

چودھری رحمت علی نے انہیں ڈانٹتے ہوئے کہا ''بہت بے شرم ہو تم، تمہیں بڑوں کا ذرا بھی لحاظ نہیں'' چودھری رمضان نے اٹھ کر آگے بڑھتے ہوئے کہا ''چودھری جی یہاں بیٹھے دانت نکال رہے ہیں اور اندر سنگھ اپنے محلے کے سارے آدمیوں کو لے کر نالے کا بند توڑنے جا رہا ہے میں نے ان کی باتیں سنی ہیں، وہ لڑائی کے لیے تیار ہو کر گئے ہیں اور ان کے ساتھ دوسرے گاؤں کے چھ سات بدمعاش بھی ہیں۔ چودھری جی اگر انہیں نہ روکا گیا تو آپ کے ساتھ میری فصل بھی برباد ہو جائے گی۔''

رحمت علی نے کہا ''اچھا اندر سنگھ شرارت سے باز نہیں آتا، پچھلے سال انہوں نے اپنی زمین کی حفاظت کے لیے بند نہیں لگایا تھا۔ اب پانی آ گیا ہے تو وہ یہ چاہتے ہیں کہ ان کے ساتھ ہماری فصل بھی برباد ہو جائے۔''

رمضان نے کہا ''ان کا خیال ہے کہ اگر آپ کا بند توڑ دیا جائے تو ان کے کھیتوں کی طرف نالے کے پانی کا زور کم ہو جائے گا آج گاؤں کے تمام سکھ اس کے ساتھ ہیں اور وہ سب شراب سے بدمست ہو کر گئے ہیں ان کے پاس لاٹھیاں اور برچھیاں ہیں اور شاید پستول بھی ہو''

''ہم نے کئی بار ان کی بہادری دیکھی ہے، غلام حیدر! جاؤ نور محمد اور علی محمد کو خبر

دو۔۔۔۔۔۔اور اسماعیل تم باقی آدمیوں کو بلا لاؤ!"

نور محمد اور علی محمد چودھری رحمت کے چھوٹے بھائی تھے ان کی حویلیاں اور رہائشی مکانات گاؤں سے باہر تھے نور محمد کے پانچ اور علی محمد کے تین بیٹے تھے۔

آن کی آن میں رحمت کی حویلی کے اندر پچیس آدمی جمع ہو گئے۔

چودھری رمضان ایسے معاملات میں بہت زیادہ مبالغہ آرائی سے کام لیا کرتا تھا لیکن اندر سنگھ کے محلے سے آنے والے چند اور آدمیوں نے اس بات کی تصدیق کر دی کہ آج اندر سنگھ کی نیت ٹھیک نہیں ہے۔



گاؤں سے باہر برساتی نالے کے کنارے فریقین ایک دوسرے کے سامنے کدالیں، لاٹھیاں اور برچھیاں اٹھائے کھڑے تھے۔ مصالحانہ گفتگو ختم ہو چکی تھی اندر سنگھ بند توڑنے پر بضد تھا۔

گاؤں کے پانچ چھ سکھوں کے سوا جو چودھری رحمت علی کی طرفداری کا اعلان کر چکے تھے، باقی سب اندر سنگھ کے ساتھ تھے پڑوس کے گاؤں کے چھ نوجوان بھی اس کے ساتھ تھے لیکن اندر سنگھ کا بیٹا شیر سنگھ جسے وہ مدت سے اس دن کے لیے تیار کر رہا تھا، کہیں غائب تھا اس کے ساتھی دوسری طرف افضل کو دیکھ کر گھبراتے تھے اور وہ انہیں تسلی دے رہا تھا کہ افضل کے لیے شیر سنگھ کافی ہے، وہ آ ہی رہا ہو گا۔

چودھری رمضان نے زبانی جنگ میں سب سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا لیکن جب

فریقین جسمانی قوت کا مظاہرہ کرنے کے لیے بے قراری ظاہر کرنے لگے تو ادھر ادھر دیکھ کر وہ نالے کے کنارے سرکنڈوں اور جھاڑیوں میں چھپ گیا۔

فریقین کے درمیان حد فاصل کم ہو رہی تھی اور قریب تھا کہ وہ ایک دوسرے پر پل پڑیں، اچانک شیر سنگھ جھاڑیوں کی آڑ سے نمودار ہوا اور ان کے درمیان کھڑا ہو کر چلایا ''ٹھہرو! ٹھہرو!! یہ لڑائی نہیں ہو گی!''

لوگوں پر ایک لمحہ کے لیے سکوت طاری ہو گیا۔

شیر سنگھ نے اپنے باپ کی طرف متوجہ ہو کر کہا ''باپو میں نے گھر میں آپ کو منع کیا تھا جب آپ نے میری بات نہ مانی تو میں ان لوگوں کے آنے سے پہلے بند کی حفاظت کے لیے یہاں چلا آیا۔''

اندر سنگھ کا دوسرا لڑکا چلایا ''باپو! شیر سنگھ کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔''

شیر سنگھ نے کہا ''کل تک میرا دماغ خراب تھا لیکن آج نہیں تم میرے دودھ کے بھائی ہو لیکن افضل میرا دھرم کا بھائی ہے جو لاٹھی افضل کی طرف اٹھے گی، میں اسے اپنے سر پر روکوں گا!''

گاؤں میں کسی نے برسوں سے شیر سنگھ اور افضل کو ایک دوسرے کے ساتھ بے تکلفی سے اٹھتے بیٹھتے نہیں دیکھا تھا، وہ حیران تھے۔

اندر سنگھ غصے سے کانپتا اور گالیاں دیتا ہوا آگے بڑھا اور اس نے شیر سنگھ کو ایک لاٹھی ماردی۔ لاٹھی شیر سنگھ کی ران پر لگی لیکن وہ چٹان کی طرح کھڑا رہا اندر سنگھ نے دوسری بار لاٹھی اٹھائی لیکن اتنی دیر میں افضل نے بھاگ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اندر سنگھ

اس کی آہنی گرفت میں بے بس ہو کر رہ گیا۔

شیر سنگھ نے کہا "افضل! یہ میرا باپ ہے، تم اس کے ہاتھ نہ پکڑو، اسے اپنا غصہ نکال لینے دو۔ چھوڑ دو افضل، باپ کی لاٹھیوں سے کوئی مرا نہیں کرتا۔"

افضل نے قدرے تذبذب کے بعد اندر سنگھ کا ہاتھ چھوڑ دیا اندر سنگھ نے دوبارہ لاٹھی اٹھائی لیکن اس کا سارا جسم کانپ رہا تھا بیٹے نے اپنی پگڑی اتار کر اس کے آگے سر جھکا دیا اور باپ کے ہاتھوں سے لاٹھی گر پڑی۔ ایک لمحہ ادھر ادھر دیکھنے کے بعد اندر سنگھ گاؤں کی طرف چل دیا اس کی رفتار ہر قدم پر تیز ہو رہی تھی، یہاں تک کہ وہ بھاگ رہا تھا اندر سنگھ کے دونوں چھوٹے بیٹے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے اس کے پیچھے ہو لیے۔

افضل نے کہا "شیر سنگھ جاؤ اپنے باپ کو تسلی دو!"

شیر سنگھ نے پگڑی اپنے سر پر رکھ لی اور چپکے سے گاؤں کی طرف چل دیا وہ لوگ جو اندر سنگھ کی حمایت پر لڑنے کے لیے آئے تھے۔ حیران و ششدر کھڑے تھے۔

چودھری رحمت علی آگے بڑھ کر ان کی طرف متوجہ ہوا "دیکھو بھئی! خدا کی یہ مرضی نہ تھی کہ ہمارے درمیان لڑائی ہو اس میں سب کی بھلائی ہے ہم نے پچھلے سال بند باندھ دیا تھا تم آرام سے گھروں میں بیٹھے رہے۔ اب اگر تمہارے کھیتوں میں پانی چڑھ آیا ہے تو یہ ہمارا قصور نہیں اب اگر بند توڑ دیا جائے تو ہمارا نقصان ضرور ہو گا ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہمارا بھی نقصان نہ ہو اور تم بھی بچ جاؤ اس وقت یہاں ساٹھ سے زیادہ آدمی ہیں اگر تم سب مل کر ہمت کرو تو تمہارے کھیتوں کو بچانا مشکل نہیں ہم

سب تمہاری مدد کرتے ہیں اگر ابھی بند باندھ دیا جائے تو تھوڑی دیر میں کھیتوں سے پانی اتر جائے گا اور فصل بچ جائے گی تم کام شروع کرو، میں جا کر گاؤں کے باقی آدمیوں کو گھروں سے نکالتا ہوں۔"

لوگ حیران تھے کہ یہ بات ان سے پہلے کیوں نہ کہی گئی تھوڑی دیر میں وہ پورے جوش وخروش کے ساتھ مٹی کا بند تیار کر رہے تھے پڑوس کے گاؤں کے وہ چھ آدمی جو لڑائی میں اندر سنگھ کی مدد کرنے کے لیے آئے تھے بھاگتے ہوئے اپنے گاؤں میں پہنچے اور وہاں سے تیس چالیس آدمی لے آئے شام سے کچھ دیر پہلے بند تیار ہو چکا تھا اور بارش تھم چکی تھی لیکن اس دوران میں چودھری رمضان کا کچھ پتا نہ تھا بند باندھنے کے بعد لوگوں کو ایک اور مشغلہ ہاتھ آ گیا کسی کو پانی سے بھرے ہوئے کھیت میں ایک مچھلی تیرتی نظر آ گئی اور اس نے شور مچا دیا لوگ لاٹھیاں اٹھا کر مچھلی کے پیچھے ہو لیے مچھلی کافی بڑی تھی اور پانی کی گہرائی کم تھی لوگ شور مچا رہے تھے "مارو! پکڑ لو گہرے پانی میں نہ جانے دو نکل گئی مارو!"

بالآخر لوگوں نے مچھلی کو لاٹھیوں کی ضربوں سے نڈھال کر کے پکڑ لیا۔

اب یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ اسے کون لے جائے بالآخر تھوڑی سی تکرار کے بعد لوگوں نے اس بات کا فیصلہ اسماعیل کے سپرد کر دیا۔

اسماعیل نے کہا "دیکھو بھئی! اگر تم میں سے کوئی یہ بتا دے کہ اس وقت چودھری رمضان کہاں ہے تو مچھلی اس کی"

اب چودھری رمضان کی کسی کو خبر نہ تھی لوگوں نے اس کے متعلق مختلف اندازے

لگائے لیکن اسماعیل نے سب کے دعوے رد کردیے۔

بالآخر لچھمن سنگھ نے کہا ''دیکھو اسماعیل! ہمیں پتہ ہے کہ تم یہ مچھلی نہیں چھوڑو گے اچھا بتاؤ کہاں ہے چودھری رمضان؟''

اسماعیل نے ہنستے ہوئے کہا ''جب ہم لڑنے کے لیے تیار تھے تو وہ ادھر سرکنڈوں میں چھپ گیا تھا جب اندر سنگھ نے شیر سنگھ کو لاٹھی ماری تھی تو اس نے سمجھا کہ لڑائی شروع ہوگئی ہے اور وہ جھاڑیوں میں سے ہوتا ہوا اس گنے کے کھیت میں پہنچا اور پھر ہماری مکئی کے کھیت سے گزر کر لال سنگھ کے گنے کے کھیتوں میں سے گزرتا ہوا اپنے گھر کی طرف بھاگا لیکن اتنی دیر میں ابا جی بند بندھوانے کے لیے گاؤں سے باقی آدمی لے کر آرہے تھے اس نے ان کا شور سن کر یہ خیال کیا کہ وہ اس کی تلاش میں آرہے ہیں وہ الٹے پاؤں بھاگا اور گنے کے کھیتوں میں چھپتا ہوا چچا علی محمد کے جوار کے کھیت میں جا چھپا۔ اتنی دیر میں گاؤں کے دوسرے آدمی مدد کیلئے آ رہے تھے چودھری رمضان نے جوار کا کھیت بھی اپنے لیے محفوظ، نہ سمجھا، وہ وہاں سے بھاگ کر گنے کے کھیتوں میں آ گیا اب اسے یہ پتا نہ تھا کہ وہ کس طرف جارہا ہے پانی کی کھائی میں چلتا ہوا وہ پھر اس طرف آ نکلا تم بند باندھ رہے تھے لیکن اس نے یہ سمجھا کہ تم لڑائی میں مارے جانے والوں کی لاشیں دبا رہے ہو وہ الٹے پاؤں لوٹا اور اب وہ ہمارے گنے کے کھیت میں بیٹھا ہوا ہے؟''

لچھمن سنگھ نے سوال کیا ''لیکن تمہیں یہ کیسے معلوم ہے کہ وہ تمہارے کھیت میں بیٹھا ہے؟''

اسماعیل نے جواب دیا ''بھئی میں ہی تو اسے وہاں بٹھا کر آیا ہوں''

''کب؟''

''زیادہ دیر نہیں ہوئی''

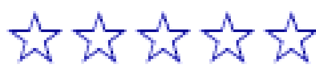
غلام حیدر نے کہا ''لیکن تمہیں اس کی ساری بھاگ دوڑ کا کیسے پتہ چلا؟''

''میں سارا دن اس کا پیچھا کرتا رہا ہوں جب وہ تھک کر بیٹھ جاتا تھا، میں اسے شور مچا کر اٹھا دیتا تھا جب وہ سرکنڈے میں چھپ رہا تھا میں نے اسے دیکھ لیا تھا جب وہ جھاڑیوں میں سے گزر کر گنے کے کھیت میں داخل ہوا تھا تو میری نظر اس پر تھی اس کے بعد میں اس کے پیچھے تھا اگر تمہیں یقین نہیں آتا تو جا کر دیکھ لو سرکنڈوں میں اس کی لاٹھی پڑی ہوئی ہے، اس کے پاس ہی جھاڑی کے کانٹوں میں اس کی پگڑی لٹک رہی ہے اور ہمارے گنے کے کھیتوں میں بھاگنے سے اس کا منہ اور پاؤں چھلنی ہو چکے ہیں۔''

چھمن سنگھ نے کہا ''لیکن وہ ابھی تک وہیں بیٹھا ہوا ہوگا؟''

اسماعیل نے کہا ''اگر میں اسے بلانے نہ جاؤں تو وہ دو دن اور وہیں بیٹھا رہے گا اسے یقین ہے کہ لڑائی میں بہت سے آدمی مارے جا چکے ہیں، پولیس پہنچ چکی ہے اور اس کی تلاش ہو رہی ہے۔''

لوگ قہقہے لگاتے ہوئے چودھری رمضان کی تلاش میں چل دیے اور اسماعیل نے مچھلی اٹھالی۔



رات کے وقت مطلع صاف ہو چکا تھا چودھری رحمت علی عشاء کی نماز پڑھ کر مسجد سے نکلا تو دروازے پر اندر سنگھ کھڑا تھا۔

اس نے کہا ''چودھری رحمت علی ! میں تم سے ایک بات کرنا چاہتا ہوں''

''کون؟ اندر سنگھ؟''

''ہاں چودھری میں ہوں، مجھے شیر سنگھ نے ابھی بتایا ہے اور میں اپنی زندگی میں پہلی بار تمہارے پاس سر جھکا کر آیا ہوں''

''کوئی بات نہیں اندر سنگھ !ایک جگہ دو برتن بھی آپس میں کھڑک جاتے ہیں اور ہم تو آدمی ہیں ہاں شیر سنگھ نے تمہیں کیا بتایا؟''

''چودھری سچ کہو تم کچھ نہیں جانتے؟''

''کس کے متعلق؟''

''اندر سنگھ نے کہا'' کل رات کے واقعے کے متعلق افضل نے تمہیں کچھ نہیں بتایا؟

رحمت علی نے جواب دیا ''رات کے متعلق افضل نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی کیا ہوا کل رات؟''

اندر سنگھ کچھ کہنا چاہتا تھا کہ افضل مسجد کے دروازے سے نکل کر بولا

''ابا جی! کل رات شیر سنگھ مجھ سے ملا وہ چاہتا تھا کہ ہمارے خاندانوں میں صلح ہو جائے میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ میں آپ کو راضی کر لوں گا۔''

اندر سنگھ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن مسجد سے کچھ آدمی نکل کر ان کے قریب کھڑے ہو

گئے اندر سنگھ خاموشی سے افضل کی طرف دیکھتا رہا۔

رحمت علی نے اندر سنگھ کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ''چلو بیٹھیں''

اندر سنگھ کوئی بات کیے بغیر ان کے ساتھ چل دیا باہر کی حویلی کے پھاٹک سے گزرتے ہوئے اس نے کہا ''بھگوان کے کھیل نیارے ہیں کل تک میرے دل میں یہ خیال بھی نہیں آ سکتا تھا کہ میں یا میری نسل سے کوئی اس دروازے کے قریب پاؤں رکھے گا لیکن آج میں بن بلائے تمہارے پاس آیا ہوں''

رحمت علی نے کہا ''مجھے افسوس ہے کہ ایسے نیک کام میں میں نے خود پہل کیوں نہ کی ہم دونوں کے بال سفید ہو گئے زندگی کا کیا بھروسہ آدمی مر جاتا ہے لیکن اس کی بات رہ جاتی ہے۔''

صحن میں چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں رحمت علی اور اندر سنگھ ایک چارپائی پر بیٹھ گئے افضل ان کے سامنے دوسری کھٹیا پر بیٹھ گیا۔ اندر سنگھ رات کے واقعہ کے متعلق اپنی شرم ندامت کا اظہار کرنے آیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ افضل اپنے باپ اور بھائیوں کو سب کچھ بتا چکا ہو گا لیکن جب رحمت علی نے لاعلمی کا اظہار کیا اور افضل نے اسے ٹالنے کی کوشش کی تو اسے اس بات کا اطمینان ہو گیا کہ افضل اس کے خاندان کو رسوا نہیں کرے گا۔ اگر اس نے اپنے باپ سے بھی اس بات کا ذکر نہیں کیا تو کسی اور کو بھی نہیں بتائے گا۔

شیر سنگھ کی شادی ہونے والی تھی اور اسے ڈر تھا کہ اگر ایسی بات مشہور ہو گئی تو اس کے سسرال والوں پر اچھا اثر نہیں پڑے گا۔ لیکن اب اس کے خدشات دور ہو چکے

تھے اور وہ تشکر اور احسان مندی کے جذبات سے مغلوب ہو کر افضل کی طرف دیکھ رہا تھا اور چاند کی روشنی میں افضل کی خاموش نگاہیں اسے کہہ رہی تھیں ”میں جانتا ہوں تم کیا کہنا چاہتے ہو لیکن اس کی ضرورت نہیں یہ راز میرے دل میں رہے گا۔“

تھوڑی دیر میں باقی چارپائیاں بھی آدمیوں سے بھر چکی تھیں اسماعیل بھی آ گیا۔ عام طور پر رحمت علی نوجوانوں کو کھل کر ہنسنے کا موقع دینے کے لیے اٹھ کر گھر چلا جایا کرتا تھا لیکن آج جب اسماعیل آیا تو اس نے کہا ”اسماعیل! اندر سنگھ کو چودھری رمضان کا قصہ سناؤ“ اسماعیل نے قدرے ہچکچاہٹ ظاہر کی لیکن باپ کے اصرار پر اس نے چودھری رمضان کی سرگزشت دہرا دی سننے والوں کے قہقہوں نے اردگرد کے گھروں کے باقی لوگوں کو بھی اس طرف متوجہ کر دیا۔ وہ حویلی کا رخ کرنے لگے۔

کچھمن سنگھ چودھری رمضان کو اس کے گھر سے اٹھا لایا کا کو عیسائی اور پیرانند نہ چوکیدار ہری سنگھ کو پکڑ لائے۔

رحمت علی نے کہا ”افضل جاؤ شیر سنگھ کو بلا لاؤ!“

تھوڑی دیر میں افضل، شیر سنگھ کو لے کر آ گیا

برسات کے ایام کسانوں کے لیے فراغت کے دن ہوتے ہیں اور یوں بھی دیہات میں وقت کی پیائش منٹوں سیکنڈوں کے پیمانے سے نہیں کی جاتی یہ محفل رات کے تیسرے پہر تک گرم رہی اسماعیل نے اپنے چودھری رمضان کی زندگی کے اہم ترین واقعات پر تبصرہ کیا اور اس کے بعد ہری سنگھ کی باری آئی جب کوئی نیند کا غلبہ محسوس کر کے اٹھتا تو دوسرے اسے پکڑ کر بٹھا لیتے اور کہتے:

"ارے یار! کیوں بھاگ رہے ہو کل سارا دن سونے کے لیے ہے"

بالآخر اسماعیل نے کہا "اچھا بھئی میں تھک گیا ہوں، تمہیں بھی نیند آ رہی ہو گی اب تم چودھری رمضان سے کہو کہ وہ اپنی مرغی کا قصہ سنائے۔"

چودھری نے یہ سنتے ہی اپنا حقہ سنبھال کر اٹھنے کی کوشش کی لیکن چھمن سنگھ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا "نہیں چودھری سنا کر جاؤ!"

رمضان نے جل کر کہا "میری کم بختی تھی جو یہاں آ گیا، آئندہ تمہارے پاس نہیں آؤں گا" وہ اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن چھمن سنگھ ادھیڑ عمر ہونے کے باوجود آٹھ روٹیاں کھاتا تھا چودھری رمضان مجبوراً بیٹھ گیا لیکن لوگوں کے اصرار کے باوجود مرغی کا قصہ سنانے کے لیے تیار نہ ہوا۔

اسماعیل نے کہا "اچھا چودھری اگر تم مرغی والا قصہ نہیں سناؤ گے تو میں منڈی کا قصہ سنا دوں گا۔"

چودھری رمضان منڈی کا قصہ چھپانے کے لیے بڑی سے بڑی قیمت ادا کرنے کے لیے تیار تھا اس نے کہا "اچھا سناتا ہوں بات یہ تھی کہ ہمارا بیلن چل رہا تھا جلال گنے لگا رہا تھا، میں گنڈیال[1] میں بیٹھا ہوا تھا کہ بلی مرغیوں کے ڈربے میں گھس گئی اور جلال کی ماں نے شور مچا دیا۔"

رمضان یہاں تک کہہ کر رک گیا لوگوں نے کہا "پھر کیا ہوا چودھری؟"

رمضان قدرے تذبذب کے بعد بولا "مرغیاں ڈربے میں چیخ رہی تھیں میں نے بلی کو ڈرایا لیکن وہ سہم کر ایک کونے کے ساتھ لگ گئی میں نے ڈربے کی کھڑکی

میں سر ڈربے کے اندر جھانکا لیکن وہاں اندھیرا تھا میں نے جلال کی ماں کو کہا ''دیا لاؤ'' وہ دیا لائی تو میں نے کہا ''تم مجھے ڈربے کے اندر روشنی دکھاؤ اور میں بلی کو پکڑ کر اس کا گلا گھونٹتا ہوں اس نے جھک کر چراغ آگے کر دیا۔

1 وہ کمرہ جس کے اندر گڑ بنانے کی بھٹی ہوتی ہے۔

کاکو نے ہنسی ضبط کرتے ہوئے پوچھا ''پھر کیا ہوا چودھری؟''

''پھر وہی ہوا جس پر تم سب دانت نکالا کرتے ہو۔۔۔ میں نے جلال کی ماں سے کہا چراغ اور آگے لاؤ، اس نے چراغ اور آگے کر دیا، میں نے ذرا اوپر کرنے کو کہا اور اس نے اوپر کر دیا، میری پگڑی کے قریب میرا خیال بلی کی طرف تھا اور میری پگڑی سلگ رہی تھی ڈربے کی ایک جانب میرے سر کا سایہ پڑ رہا تھا میں نے جلال کی ماں سے کہا چراغ نیچے کرو، اس نے نیچے کر دیا بالکل میری داڑھی کے نیچے۔ ۔۔۔ داڑھی کے بالوں کی آگ تو میں نے ہاتھ مار کر بجھا لی، لیکن پگڑی کی آگ کا مجھے اس وقت بھی علم نہ ہوا جبکہ سارے ڈربے میں دھواں بھر چکا تھا بلی نے پنجے مار کر میرا منہ نوچ لیا میں نے جلدی سے سر باہر نکالا، بلی بھاگ گئی جلال کی ماں چلائی ''تمہارے سر میں آگ لگی ہوئی ہے اور اس نے میری پگڑی اتار کر پھینک دی میں نے پگڑی کو پاؤں سے مسل کر آگ بجھائی دوبارہ ڈربے کو اچھی طرح دیکھا تو معلوم ہوا کہ بلی دو مرغیوں کا گلا چبا چکی ہے۔۔۔ یہ ہنسنے کی بات نہیں بعض دن بڑے منحوس ہوتے ہیں اس کے بعد گنڈیال کے اندر گیا تو بھٹی پر کڑاہی میں گڑ جل کر سیاہ ہو چکا تھا۔۔۔

محفل قہقہوں سے گونج اٹھی لوگ مارے ہنسی کے لوٹ پوٹ ہو رہے تھے چودھری رمضان گھبرا کر اٹھا اور لوگوں کو پھلانگتا، گرتا پڑتا گھر کی طرف بھاگ گیا۔

رمضان کے چلے جانے کے بعد اسمایل نے اندر سنگھ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ''چچا ایک بات اور سنو چودھری رمضان کے باپ کی گھوڑی نے بچھیری دی اور چودھری رمضان کو اس بات کا شوق ہوا کہ اس کی شادی تک سواری کے قابل ہو جائے ، اس لیے یہ گھر والوں سے چوری اسے بھینس کا دودھ پلایا کرتا تھا جب اس کی برات گئی تو وہ اپنی بچھیری پر جواب گھوڑی بن چکی تھی ،سوار تھا راستہ میں ہم نے گھوڑیاں بھگا ئیں، لیکن اس کی گھوڑی پر بھینس کا اثر تھا، وہ گرمی کی تاب نہ لا سکی۔ چنانچہ جب ہم ان کی سسرال کے گاؤں میں پہنچے تو گھوڑی دولہا سمیت گندے پانی کے جوہڑ میں گھس گئی۔۔۔۔۔''

اندر سنگھ ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہو رہا تھا رات زیادہ گزر چکی تھی اسماعیل کو نیند آ رہی تھی، وہ اٹھا اور اس کے ساتھ ہی لوگ ایک ایک دو دو کر کے جانے لگے۔

جب یہ محفل برخاست ہوئی تو اندر سنگھ نے اٹھتے ہوئے کہا:

''چودھری رحمت علی! میں جس کام کے لیے آیا تھا، وہ مجھے یاد ہی نہیں رہا بات یہ ہے کہ اگلے چاند کی دس تاریخ کو شیر سنگھ کی شادی ہے اور آپ سب کو برات میں جانا پڑے گا تحصیلدار کو بھی لکھ دیں کہ وہ دو دن کی چھٹی لے آئے۔''

رحمت علی نے کہا'' کیوں نہیں، شیر سنگھ کی شادی پر تو ہم ضرور جائیں گے ہاں روپے پیسے کی ضرورت ہو تو کسی ساہوکار کے پاس نہ جایئے گا ہم انتظام کر لیں گے''

اندر سنگھ نے جواب دیا ''چودھری جی آپ کی بڑی مہربانی لیکن میں سارا انتظام کر چکا ہوں سیٹھ رام چند گھر آ کر مجھے آٹھ سو روپیہ دے گیا تھا۔''

رحمت علی نے قدرے سنجیدہ ہو کر کہا ''بھائی لڑکوں پر قرضے کا بوجھ نہ ڈالو میں نے سنا ہے کہ پہلے بھی تم رام چندر کے مقروض ہو''

اندر سنگھ نے کہا '' معمولی قرضہ ہے، اتر جائے گا چودھری جی ہاں برات کے لیے گھوڑوں کا بندوبست آپ کو کرنا پڑے گا!''

''گھوڑوں کی تم فکر نہ کرو۔۔۔۔۔اور کوئی ضرورت بھی ہو تو حاضر ہوں''

یہ دو خاندانوں کے نئے تعلقات اور دو نوجوانوں کی دوستی کا پہلا دن تھا



سلیم، مجید، رام لال اور گلاب سنگھ نے چوتھی جماعت کا امتحان ایک ساتھ پاس کیا اور وہ گاؤں سے تین میل کے فاصلے پر شہر کے ہائی سکول میں داخل ہو گئے، پرائمری سکول والے گاؤں سے موہن سنگھ، معراج الدین اور ماسٹر کا لڑکا علی احمد بھی ان کے ساتھ ہی ہائی سکول میں داخل ہوئے داؤد دو سال قبل پرائمری کی تعلیم ختم کر کے سکول چھوڑ چکا تھا اور شہر کے کارخانے میں مزدور بھرتی ہو گیا تھا جلال اور بشیر بھی سکول چھوڑ کر مویشی چرایا کرتے تھے۔

سلیم کے گاؤں اور شہر کے درمیان ایک گاؤں اور تھا جہاں سے چند لڑکے سکول جایا کرتے تھے ان میں سے دو لڑکے بلونت سنگھ اور مہندر سنگھ، سلیم کے ساتھ بہت

جلد مانوس ہو گئے بلونت سنگھ، سلیم اور مجید کے ساتھ پانچویں جماعت میں پڑھتا تھا اور مہندر سنگھ جو بلونت سنگھ کا چھوٹا بھائی تھا، پرائمری کی تیسری جماعت میں پڑھتا تھا بلونت سنگھ اور مہندر کا باپ شہر کے کارخانے میں ہیڈ کلرک تھا اس گاؤں سے سلیم کا ایک اور ہم جماعت کندن لال تھا اس کا باپ رام چند علاقہ کا مشہور ساہوکار تھا وہ ارد گرد کے دیہات کے کسانوں کو بیاہ شادی کے موقعوں پر قرضے دیا کرتا تھا کسان اس کے بہی کھاتہ پر انگوٹھا لگا کر روپیہ لے لیتے اور دھوم دھام سے اپنے لڑکے اور لڑکیوں کی شادی رچاتے اور سیٹھ رام چند ان کے بیٹوں اور پوتوں سے سود در سود وصول کرتا جس سال شادیاں کم ہوتیں اس سال وہ کسانوں کی لڑائیاں کروا دیا۔ پولیس آتی اور لڑنے والوں کو ہتھکڑیاں لگا لیتی اور سیٹھ رام چند اپنا بہی کھاتہ اور روپیہ لے کر ان کی مدد کو پہنچ جاتا موقع کی نزاکت کے پیش نظر کسان جتنے روپے لیتے اس سے دوگنی رقم کی رسید لکھ دیتے۔ پھر وہ کہتا ''دیکھو بھئی تھانیدار بہت سخت ہے، میں تمہارے طرف سے یہ روپے لے کر اس کے پاس جاتا ہوں لیکن مجھے ڈر ہے کہ وہ میری بے عزتی نہ کر ڈالے'' لوگ اسے دعائیں دیتے اگر دو سو روپیہ ہوتا تو وہ سوا پنے پاس رکھ لیتا اور باقی سو تھانیدار کو پیش کر کے کہتا ''تھانیدار صاحب! ان بے چاروں کے پاس کچھ نہ تھا، لیکن آپ کی خاطر میں نے انہیں یہ ایک سو روپیہ قرض دیا ہے انہوں نے میرے پہلے قرضے بھی ادا نہیں کیے مجھے کسی دن آپ کی مدد لینی پڑے گی۔''

اور جب پھر ان کی ہتھکڑیاں کھول دی جاتیں تو وہ کسانوں سے کہتا ''دیکھو بھئی!

تھانیدار نہیں مانتا تھا، اس نے دو سو روپیہ میرے منہ پر دے مارا۔ پھر میں نے منت کی تو وہ بڑی مشکل سے مانا اب ادائیگی میں سستی نہ کرنا!'' اس طرح رام چند کی جیب سے روپیہ نکلتا اور کسان سود در سود کے ساتھ چار سو کی قسطیں ادا کرتے۔

اگر تھانے دار ایمان دار ہوتا تو رام چند کسانوں کو دیوانی اور فوجداری کی عدالتوں میں مقدمے لڑنے کی ترغیب دیتا اور وہ اس سے قرض لے کر وکیلوں کی فیس ادا کرتے۔ ان سب باتوں کے باوجود رام چند کے دیوتا اس پر بہت خوش تھے اور انہیں خوش رکھنے کے لیے وہ اتوار کے دن پوجا پاٹ کے بعد چیونٹیوں اور مکوڑوں کے بلوں کے سامنے اناج کی چند مٹھیاں بکھیر آیا کرتا تھا۔



گاؤں سے اسکول جاتے ہوئے سلیم اپنے ساتھیوں کو ایک کہانی سنا رہا تھا گلاب سنگھ اور رام لال حسب معمول اس کی کہانی گہری توجہ سے سن رہے تھے مجید کے ہاتھ میں ربڑ کی غلیل تھی اور وہ چلتے چلتے مختلف چیزوں پر نشانے کی مشق کر رہا تھا ایک درخت پر چڑیا بیٹھی تھی مجید نے اپنے ساتھیوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے کہا ''دیکھو میں ابھی چڑیا کو گراتا ہوں'' لیکن گلاب سنگھ اور رام لال کہانی سننے میں اس قدر محو تھے کہ انہوں نے اس کی طرف مڑ کر بھی نہ دیکھا مجید نے چڑیا کا خیال چھوڑ دیا اور تیزی سے ان کے قریب پہنچتے ہوئے کہا ''سلیم کی کہانی بالکل غلط ہے میں اسے جانتا ہوں یہ ساری باتیں گھر بیٹھ کر گھڑتا ہے۔''

سلیم خاموش ہو گیا لیکن گلاب سنگھ نے کہا ”اگر تمہیں پسند نہیں تو نہ سنو، ہم تو ضرور سنیں گے۔۔۔۔ سناؤ سلیم!“

مجید نے کہا ”بس میں نہیں سننے دوں گا!“

”اچھا نہ سننے دو ہم اتوار کے دن تمہارے ساتھ مچھلیاں پکڑنے نہیں جائیں گے تمہارے ساتھ نہر پر نہانے بھی نہیں جایا کریں گے اور تمہارے ساتھ کھیلیں گے بھی نہیں کیوں رام لال؟“

رام لال نے سر ہلا کر گلاب سنگھ کی تائید اور مجید نے اپنے ساتھیوں کو بغاوت پر آمادہ دیکھ کر کہا ”اچھا سلیم سناؤ نہیں کہانی“

سلیم نے بگڑ کر کہا ”بس میں نہیں سناؤ گا“

مجید نے کہا ”ارے میں تو مذاق کر رہا تھا تمہاری کہانی تو بالکل سچی تھی“

سلیم نے کہا ”سچی ہو یا جھوٹی، میں نہیں سناؤں گا“

مجید، رام لال اور گلاب سنگھ اسے منا رہے تھے کہ سامنے سے کسی کی آواز آئی

سلیم! سلیم!! میں کب سے یہاں کھڑا ہوں جلدی آؤ نا!

یہ پٹواری کا لڑکا معراج الدین تھا وہ حسب معمول اس جگہ کھڑا تھا جہاں اس کے گاؤں سے شہر کی طرف جانے والی پگڈنڈی ان کے راستے کے ساتھ آملتی تھی۔

یہ قریب پہنچے تو معراج الدین نے کہا ”اچھا اب کہانی سناؤ!“

معراج الدین کے اصرار پر علیم کہانی سنانے کے لیے تیار ہو گیا اس نے کہا ”جب شہزادے کو بھوکے شیر کے پنجرے میں ڈالا گیا تو۔۔۔!“

لیکن معراج الدین نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا ”لیکن شہزادے کو بھوکے شیر کے پنجرے میں کیوں ڈالا گیا؟“

سلیم نے جواب میں ”یہ میں انہیں بتا چکا ہوں“

معراج الدین نے کہا ”لیکن میں نے نہیں سنا مجھے شروع سے سناؤ!“

گلاب سنگھ نے کہا ”نہیں نہیں، شروع سے نہیں“

اب گلاب سنگھ اور رام لال یہ سننے کے لیے بے قرار تھے کہ جب شہزاد بھوکے شیر کے پنجرے میں ڈالا گیا تو کیا ہوا اور معراج الدین کے لیے یہ جاننا ضروری تھا کہ بیچارے شہزادے کو بھوکے شیر کے پنجرے میں کیوں ڈالا گیا۔

اس بحث سے مجید کو بھی کہانی کے ساتھ دل چسپی ہو گئی اور اس نے کہا سلیم شروع سے سناؤ تو میں بھی سنوں گا

سلیم کو دوبارہ ابتدا کرنا پڑی لیکن وہ ابھی بھوکے شیر کے پنجرے تک نہیں پہنچا تھا کہ بلونت کا گاؤں آ گیا بلونت سنگھ، مہندر سنگھ اور کندن لال راستے میں کھڑے ان کا انتظار کر رہے تھے انہوں نے بھی یہ کہانی شروع سے سننے پر اصرار کیا ان لڑکوں کے ساتھ سلیم کی نئی نئی دوستی ہوئی تھی اس لیے ان کا مطالبہ رد کرنا اس کے لیے آسان نہ تھا لیکن مجید کہہ رہا تھا کہ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔

جب بلونت سنگھ نے اصرار کیا تو گلاب سنگھ اس کے ساتھ لڑنے کے لیے تیار ہو گیا ”جاؤ سلیم دوسرے گاؤں کے لڑکوں کو کہانی نہیں سناتا“

بلونت سنگھ اور کندن لال ناراض ہو کر چل دیے لیکن مہندر سنگھ جو سب سے چھوٹا

تھا اور جسے کہانیوں کے ساتھ سب سے زیادہ دلچسپی تھی منہ بسور کر سلیم کی طرف دیکھتا رہا، جب سلیم اور باقی لڑکے اس کی طرف توجہ کیے بغیر چل دیے تو وہ بستہ ایک طرف پھینک کر زمین پر بیٹھ گیا۔

سلیم ایک لمحہ کے لیے مڑ کر اس کی طرف دیکھتا رہا لیکن مجید نے اس کا بازو پکڑ کر آگے دھکیلتے ہوئے کہا ''چلو سلیم دیر ہو رہی ہے!''

سلیم بادل ناخواستہ چل پڑا بلونت سنگھ نے ایک کھیت آگے جا کر پیچھے دیکھا اور مہندر سنگھ کو آواز دی ''مہندری سنگھ کے بچے دیر ہو رہی ہے!'' لیکن مہندر سنگھ ٹس سے مس نہ ہوا۔

بلونت سنگھ چند آوازیں دینے کے بعد برہم ہو کر چل دیا۔ اس کا خیال تھا کہ جب وہ کچھ دور آگے نکل جائیں گے تو وہ خود بخود بھاگتا ہوا آ جائے گا باقی لڑکوں کا بھی یہی خیال تھا لیکن ان کی یہ توقع پوری نہ ہوئی وہ دو کھیت آگے نکل گئے لیکن مہندر سنگھ نے ان کی طرف دیکھنے کی بھی ضرورت محسوس نہ کی۔

کندن لال نے بلونت سنگھ سے کہا ''ارے یار تم اسے دو چار تھپڑ کیوں نہیں لگاتے!''

بلونت سنگھ ایسی نصیحت پر عمل کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتا تھا اس نے جلدی سے بستہ زمین پر رکھا اور بھاگ کر مہندر سنگھ کے قریب پہنچتے ہوئے اسے دو مکے رسید کر دیے مہندر سنگھ پہلے ہی بھرا بیٹھا تھا وہ زمین پر لیٹ کر چلانے لگا بلونت سنگھ اسے بازو سے پکڑ کر اٹھا رہا تھا لیکن وہ زمین پر بچھا جا رہا تھا سلیم اپنا بستہ رام لال

کے حوالے کر کے بھاگتا ہوا ان کے قریب پہنچا اور بولا ''بلونت! تم بہت ظالم ہو، اسے مارتے ہو''

بلونت سنگھ نے شکست خوردہ سا ہو کر کہا ''اس سے پوچھا کہ یہ بیٹھ کیوں گیا ہے مجھے سکول جانے میں دیر ہو رہی ہے۔''

سلیم نے کہا ''چلو مہندر! دیر ہو رہی ہے!''

مہندر سنگھ نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا ''تم جاؤ میں نہیں جاؤں گا''

سلیم نے اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا ''دیکھو مہندر تم مجھ سے ناراض ہو گئے؟''

مہندر نے اس کی طرف دیکھا اور بھولے پن سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

اچھا اب اٹھو میں تمہیں شروع سے کہانی سناؤں گا

مہندر کو اپنے بھائی کی مار بھول گئی اور اس نے کہا ''ساری سناؤ گے نا؟''

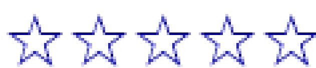
''ہاں ساری سناؤں گا''

''کل بھی سناؤ گے نا؟''

''ہاں کل بھی سناؤں گا''

مہندر نے جلدی سے بستہ اٹھا لیا لیکن کچھ سوچ کر بولا ''میرے بغیر کسی اور کو تو نہیں سناؤ گے؟''

''نہیں تمہارے بغیر کسی اور کو نہیں سناؤں گا''



مجید کا چچا زاد بھائی اور ایک تحصیل دار کا لڑکا ہونے کے باعث سلیم اپنے ہم مکتبوں میں کافی احترام سے دیکھا جاتا تھا۔لڑکوں پر اس کی ذہانت کا رعب بھی تھا۔ اسکول میں صرف وہی لڑکا ایسا تھا جس نے کبھی ماسٹر جی سے مار نہیں کھائی تھی۔اس کے علاوہ وہ اپنے ساتھیوں کو عجیب وغریب کہانیاں سنایا کرتا تھا اور اس کی کہانیاں کبھی ختم نہیں ہوا کرتی تھیں۔چھٹی کے بعد بہت سے لڑکے صرف اس کی کہانی سننے کے شوق میں اس کے گاؤں تک جایا کرتے تھے۔جب وہ سناتے سناتے رک جاتا تو لڑکے بے قراری سے پوچھتے ''پھر کیا ہوا سلیم؟''

وہ جواب دیتا ''باقی کل سناؤں گا''

لڑکے مایوس ہو کر چلے جاتے اور سلیم رات کے وقت اپنے بستر پر لیٹ کر کہانی کا باقی حصہ سوچ لیتا۔اگلے دن پھر وہ اپنی طویل کہانی کا نیا حصہ کسی ایسے واقعے کی تمہید سے ختم کرتا کہ سننے والے اختتام کے لیے بیقرار رہتے۔سلیم کی اس غیر معمولی صلاحیت کا اس کے خاندان کی عورتوں اور بچوں کو بھی علم تھا لیکن ایک واقعہ سے اس خاندان کے بزرگ بھی یہ محسوس کرنے لگے کہ برخوردار لوگوں کو پریشان کرنے کے لیے عجیب وغریب کہانیاں ایجاد کرنے میں کافی مہارت پیدا کر چکا ہے۔بات یہ ہوئی کہ پٹواری کے لڑکے معراج الدین کو سلیم نے ایک کہانی سنائی تھی اور حسب معمول اسے ایک عجیب وغریب الجھن میں ڈالنے کے بعد باقی حصہ اگلے دن سنانے کا وعدہ کر کے گھر چلا آیا تھا۔معراج الدین کی توجہ کہانی میں اس قدر جذب ہو چکی تھی کہ اسے یہ بات یاد نہ رہی کہ اگلے دن اتوار ہے اور اس کے بعد عید کی دو

چھٹیاں ہیں۔

عید کے دن سلیم گاؤں سے باہر لڑکوں کے ساتھ کھیل رہا تھا کہ اس کے چچا نے آ کر کہا ''سلیم گھر جاؤ، بھابی جان تمہیں بلاتی ہیں'' سلیم گھر پہنچا تو خانان کی عورتوں کے درمیان ایک ساٹھ سالہ بڑھیا بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے دائیں اور بائیں دو بچے تھے ایک معراج الدین تھا اور ایک لڑکی تھی۔ جس کا سفید رنگ اور بھورے بال اس بات کی شہادت دیتے تھے کہ وہ معراج الدین کی بہن ہے۔

سلیم کی ماں نے اسے دیکھتے ہی کہا ''لو ماں جی! سلیم آ گیا!''

بڑھیا نے کہا ''آؤ بیٹا آؤ میں تمہیں ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھک گئی ہوں''

سلیم کی چچا زاد بہن امینہ مارے ہنسی کے لوٹ پوٹ ہو گئی دوسری لڑکیوں اور عورتوں نے بھی بڑی مشکل سے ہنسی ضبط کی سلیم کی دادی نے امینہ کو ڈانٹ کر محفل سے اٹھا دیا، تاہم وہ دروازے کے پیچھے کھڑی ہو کر قہقہے لگاتی رہی۔

سلیم پریشانی کی حالت میں کھڑا تھا، اس کی ماں نے کہا ''سلیم یہ تمہارے دوست کی دادی ہیں آگے بڑھ کر سلام کرو!''

سلیم ہچکچاتا ہوا آگے بڑھا بڑھیا نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا ''بیٹھ جاؤ بیٹا! میں تمہارے لیے عید کے دن اپنا گھر چھوڑ کر آئی ہوں'' عورتیں بڑی مشکل سے اپنی ہنسی کو ضبط کر رہی تھیں سلیم نے اپنی ماں کی طرف دیکھا ماں نے ہاتھ سے اشارہ کیا اور اسے اپنی مرضی کے خلاف بڑھیا کے قریب بیٹھنا پڑا۔

معراج الدین کی دادی نے کہا ''بیٹا! معراج الدین دو راتوں سے خواب میں

بڑبڑاتا رہا ہے۔ اس نے میرا ناک میں دم کر رکھا ہے آج عید کے دن اس نے اس شرط پر نئے کپڑے پہنے تھے کہ میں اسے سلیم کے گھر لے جاؤں گی اور یہ سکینہ بھی دو دن سے میری جان کھاتی رہی ہے میں خود یہ چاہتی تھی کہ عید کے بعد جب سکول کھلے، میں معراج کے ابا کو بھیج کر تمہیں گھر بلواؤں اور تم سے باقی کہانی سنوں لیکن جب ان بچوں نے تنگ کیا تو مجھے تمہارے گھر آنا ہی پڑا ہاں بیٹا پھر کیا ہوا؟''

سلیم اب سوچ رہا تھا کہ اس نے کہانی کہاں ختم کی تھی معراج الدین کی دادی نے کہا ''بیٹا! اب میں سنے بغیر نہ جاؤں گی ہاں بتاؤ بادشاہ اژدہا کے پیٹ سے کیسے نکلا؟''

کواڑ کے پیچھے سلیم کی دوسری چچا زاد بہن صغریٰ اور اس کی چھوٹی بہن زبیدہ بھی امینہ کے قریب پہنچ کر اس کے قہقہوں میں شریک ہو چکی تھیں لیکن سلیم کو ان کے قہقہوں سے زیادہ بڑی عمر کی خواتین کی زیر لب مسکراہٹیں پریشان کر رہی تھیں، وہ اس صورتحال کی تمام ذمہ داری معراج الدین پر عاید کر رہا تھا اور یہ فیصلہ بھی کر چکا تھا کہ اپنی زندگی کا یہ نازک مرحلہ عبور کرنے کے بعد معراج الدین کو کبھی کہانی نہیں سنائے گا۔ اس کے لیے بھاگنے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ اس کی ماں، اس کی دادی اور گھر کی دوسری عورتیں اس کی پسلیوں میں انگلیاں چبھو رہی تھیں۔ دو دن کھیل کود میں مصروف رہنے کے باعث اسے کہانی کا نیا حصہ تیار کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اگر صرف معراج الدین کا سوال ہوتا تو وہ دماغ پر بوجھ دیے بغیر بھی اژدہا کے پیٹ میں پھنسے ہوئے بادشاہ کے لیے کوئی نہ کوئی راستہ نکال لیتا لیکن بڑھیا کے چہرے کی

جھریاں یہ بتا رہی تھیں کہ وہ پھنسے ہوئے بادشاہ کو نکالنے کے لیے اس کی کسی بے معنی ترکیب کو پسند نہیں کرے گی۔

سلیم کی پریشانی میں اضافہ کرنے کے لیے اس کی ماں نے بڑھیا سے کہہ دیا۔ ''ماں جی! شاید سلیم کو کہانی کا پچھلا حصہ بھول گیا ہے، آپ اسے یاد دلا دیں۔''

بڑھیا پر امید ہو کر بولی ''ہاں بیٹا! میں تمہیں یاد دلاتی ہوں بادشاہ دوسرے ملک کی شہزادی کے ساتھ شادی کرنے کے لیے اس کی بہت سی شرطیں پوری کر چکا تھا، اب صرف ایک شرط باقی تھی کہ وہ پہاڑوں سے سونے کے سینگوں والے ہرن کو پکڑ کر لائے وہ اپنی فوج کے ساتھ کئی دن سونے کے سینگوں والے ہرن کا پیچھا کرتا رہا ایک دن وہ ہرن ایک بہت بڑے پہاڑ کے غار میں غائب ہو گیا۔ بادشاہ اور اس کی فوج اس کے پیچھے غار میں داخل ہو گئی لیکن یہ پہاڑ نہ تھا، یہ ایک بہت بڑا اژدہا تھا اور وہ غار اس اژدہے کا منہ تھا۔ جب بادشاہ اور اس کی فوج اندر داخل ہو گئی تو اژدہا نے اپنا منہ بند کر لیا۔ اس کے بعد کیا ہوا بیٹا؟'' اب تمام عورتیں سنجیدگی سے سلیم کی طرف دیکھ رہی تھیں امینہ اور صغریٰ بھی اس کے قریب آ کر بیٹھ گئی تھیں۔

معراج الدین نے کہا ''دادی جان آپ نے یہ نہیں بتایا کہ بادشاہ کی فوج کے ساتھ اس کے گھوڑے، ہاتھی اور کتے بھی اژدہے کے پیٹ میں داخل ہو چکے تھے!''

معراج الدین کی یادداشت نے سلیم کی مشکلات میں اور اضافہ کر دیا۔ انسانوں کو نکالنے کے لیے پیٹ میں جس معمولی سی سرنگ کی ضرورت تھی، وہ شاید چاقوؤں اور تلواروں کے ساتھ تیار ہو جاتی لیکن اب آدمیوں کے ساتھ ہاتھی گھوڑے بھی آ

پھنسے تھے اور انہیں نکالنے کے لیے ایک کشادہ گزرگاہ کی ضرورت تھی۔ مسئلہ جس قدر اہم تھا، اسی قدر نازک تھا اور تمام عورتیں یہ محسوس کر رہی تھیں کہ بڑھیا بے چاری بلاوجہ نہیں آئی۔

بڑھیا نے کہا ''جب معراج الدین اور سکینہ نے مجھے تنگ کیا تو میں نے ان کے باپ کو کہانی کا باقی حصہ سنانے پر مجبور کیا۔ وہ کہتا تھا کہ اس نے یہ کہانی نہیں سنی لیکن اگر سچ مچ اژدہا اتنا بڑا تھا اور منہ بند ہو چکا تھا تو بادشاہ اور اس کے ساتھی دم گھٹ کر مر گئے ہونگے لیکن سلیم معراج کو یہ بتا چکا ہے کہ بادشاہ باقی تمام مصیبتوں کی طرح اس مصیبت سے بھی بچ کر آئے گا میں ان بچوں کو لے کر ماسٹر کے گھر بھی گئی تھی لیکن وہ بھی یہی کہتا تھا کہ بادشاہ مر جائے گا۔ سلیم کی ماں! اتنا تو میں بھی جانتی ہوں کہ بادشاہ، شہزادی کے ساتھ شادی کرنے سے پہلے نہیں مر سکتا، جس طرح اس نے باقی چھ شرطیں پوری کی ہیں، اسی طرح یہ ساتویں شرط بھی پوری کرے گا لیکن وہ نکلے گا کیسے؟''

جب بڑھیا باتیں کر رہی تھی، سلیم غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے نچلے جبڑے میں درمیان سے دو دانت ٹوٹے ہوئے تھے اور باتیں کرتے وقت اس کی زبان ہلتی نظر آتی تھی۔ سلیم نے سوچا کہ اگر ان اکھڑے ہوئے دانتوں کی جگہ وہ اپنی انگلی رکھ دے تو بڑھیا کوشش کے باوجود بھی اسے نہیں کاٹ سکتی۔ بڑھیا کے باقی دانت بھی باتیں کرتے وقت ہلتے تھے۔ سلیم جانتا تھا کہ بڑھاپے میں لوگوں کے دانت ہلتے ہیں اور پھر نکل جاتے ہیں اور اچانک اسے ایک خیال آیا اور

اسکی آنکھیں چمک اٹھیں اس نے گردن اٹھا کر چاروں طرف دیکھا اہل محفل کی سنجیدگی اس بات کا اعلان کر رہی تھی کہ اگر یہ معما حل نہ ہوا تو نہ صرف اس کی توہین ہوگی، بلکہ سارے خاندان کے وقار کو صدمہ پہنچے گا۔

سلیم نے کہا ''اچھا سناتا ہوں''

بڑھیا نے کہا ''شاباش بیٹا!''

سلیم شاباش سے بے نیاز تھا وہ صرف جان چھڑانا چاہتا تھا وہ بولا ''بادشاہ نے سینگوں والے ہرن کو گھیر کر پکڑ لیا لیکن اس کے بعد اسے معلوم ہوا کہ وہ غار کی بجائے اژدہے کے پیٹ میں ہے، جس کا منہ بند ہو چکا تھا۔ اس کے دانت جو ہماری حویلی کے پھاٹک سے بھی بڑے تھے، آپس میں ملے ہوئے تھے لیکن اژدہا بہت بوڑھا ہو چکا تھا اور اس کا ایک دانت ہلتا تھا بادشاہ نے تمام گھوڑوں اور ہاتھیوں کے رسے جمع کر کے ایک بہت موٹا اور مضبوط رسا بنوایا اور اس کا ایک سرا اژدہا کے دانت سے باندھ دیا اور دوسرے سرے کے ساتھ سارے ہاتھی اور گھوڑے جوت دیے۔ وہ دو دن زور لگاتے رہے تھے، تیسرے دن دانت اکھڑ گیا۔ دانت نکل جانے سے اژدہے کے منہ میں بہت بڑا دروازہ بن گیا اور بادشاہ، فوج، ہاتھی، گھوڑے، کتے سب باہر نکل آئے۔ وہ اژدہا اتنا بڑا تھا کہ اسے معلوم بھی نہ ہوا۔''

سلیم نے یہاں تک کہہ کر اپنے ارد گرد فاتحانہ انداز سے دیکھا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا لیکن بڑھیا کی تشنگی ابھی باقی تھی، اس نے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے سلیم کے بازو پکڑ لیے اور کہا ''پھر کیا ہوا بیٹا! مجھے ساری کہانی سنا کر جاؤ!'' سلیم نے

کھڑے کھڑے بات ختم کر دی ''بادشاہ سونے کے سینگوں والا ہرن لے کر شہزادی کے پاس پہنچ گیا شہزادی کی ساتوں شرطیں پوری ہو چکی تھیں، اس لیے ان کا بیاہ ہو گیا بس!''

جب معراج الدین کی دادی سلیم کے گھر سے نکلی تو وہ یہ محسوس کر رہی تھی کہ اس کی کوفت رائیگاں نہیں گئی معراج الدین فخریہ انداز میں کہہ رہا تھا:

''دیکھا دادی جان! آپ کہتی تھیں کہ بادشاہ مر جائے گا''

بڑھیا نے گرج کر کہا ''میں کب کہتی تھی، تمہارا باپ اور ماسٹر دونوں بدھو ہیں''

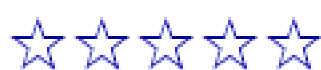
اور شام کے وقت سلیم کی ماں اسے کہہ رہی تھی ''سلیم! تم بہت شریر ہو گئے ہو، بڑوں سے مذاق نہ کیا کرو!''

اس نے معصومانہ انداز میں کہا ''میں نے کس سے مذاق کیا ہے امی جان؟''

''ادھر آؤ!''

سلیم آگے بڑھ کر ماں کے قریب کھڑا ہو گیا اور اس نے اپنی مسکراہٹ چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ''سچ کہو تم نے اس بوڑھی عورت کے دانت دیکھ کر وہ بات نہیں گھڑی تھی؟''

سلیم اس کے جواب میں سر جھکا کر مسکرا رہا تھا۔



سلیم کے لیے گاؤں کے پرائمری سکول سے شہر کے ہائی سکول کا ماحول بہت

مختلف تھا یہاں قریباً پانچ سو لڑکے تعلیم پاتے تھے استادوں کی تعداد بھی بارہ سے اوپر تھی۔ کوئی انگریزی پڑھاتا تھا، کوئی حساب، کوئی اردو، کوئی سائنس، کوئی تاریخ اور کوئی جغرافیہ اور کوئی عربی اور فارسی، لیکن طالب علموں کے نزدیک ان استادوں کی صرف تین قسمیں تھیں۔ کم مارنے والے، زیادہ مارنے اور بہت ہی زیادہ مارنے والے۔

سلیم دلچسپی کے بغیر کوئی کام کرنے کا عادی نہ تھا۔ اردو اور انگریزی کی کتابوں میں کہانیاں تھیں، اس لیے وہ انہیں شوق سے پڑھتا تھا، اسے تاریخ اور جغرافیہ سے بھی انس تھا لیکن استادوں کی مخصوص زبان میں سوالوں کے جواب رٹنا اس کی قوت برداشت سے باہر تھا۔ حساب کے ہندسوں اور جیومیٹری کی لکیروں سے بھی اسے نفرت تھی لیکن حساب کا ماسٹر بہت جابر تھا اور بد قسمتی سے سلیم کے والد کا دوست بھی تھا، وہ سب سے پہلے سلیم سے پوچھا کرتا تھا ''کیوں سلیم گھر کا کام کیا؟'' دو تین مرتبہ بنچ پر کھڑا ہونے کے بعد سلیم نے یہ تہیہ کر لیا کہ وہ آئندہ ماسٹر جی کو خفا ہونے کا موقع نہیں دے گا باقی ماسٹروں کی بھی یہی خواہش ہوا کرتی تھی کہ لڑکے روز کا سبق روز رٹ کر آئیں تاریخ اور جغرافیہ کے ماسٹر اپنے ہر سوال کا جواب درسی کتابوں کی مخصوص زبان میں سننا پسند کرتے تھے۔ گزشتہ چند برس کی ملازمت کے دوران میں ان مضامین کی درسی کتابوں کی عبارت ان کے دل پر نقش ہو چکی تھی، لڑکوں سے سوال پوچھنے سے پہلے وہ اپنی چھڑی اٹھا لیتے۔ اگر کوئی لڑکا ایک آدھ فقرہ بھول جاتا یا چند الفاظ ہی آگے پیچھے کر دیتا تو اس کی شامت آجاتی۔ انگریزی کا ماسٹر بہت نرم

دل تھا، پڑھاتے وقت وہ بچوں کی طرف گھور کر دیکھنے کا عادی نہ تھا، اس لیے وہ لڑکے جو گھروں سے تاریخ اور جغرافیہ رٹ کر نہیں آتے تھے، انگریزی کے گھنٹے میں پچھلے ڈیسکوں پر بیٹھ کر تاریخ اور جغرافیہ کی کتابیں کھول لیتے۔اسی طرح حساب کے ماسٹر کے مقابلے میں اردو کا ماسٹر قدرے نرم دل تھا۔اس لیے بعض لڑکے اردو کے گھنٹے میں اپنی ساتھیوں کی کاپیوں سے حساب کے سوال نقل کر لیتے اور غالباً یہی وجہ تھی کہ انسپکٹر صاحبان ہر سال تاریخ اور حساب کے ماسٹروں کی کارگزاری پر اظہار اطمینان فرمایا کرتے تھے۔

سکول کی مصروفیتوں کے باوجود اپنے گاؤں کے ماحول سے سلیم کی دلچسپیاں کم نہ ہو سکیں وہ گھر پہنچ کر تھوڑی دیر کے لیے اپنا بستہ کھولتا اور سکول کا کام کرتا، مجید اس کی کاپی سے حل کیے ہوئے سوال نقل کر لیتا۔پھر دونوں گھوڑوں پر سوار ہو کر گاؤں سے باہر نکل جاتے غروب آفتاب کے وقت وہ گھر آتے، دادا کا حکم تھا کہ وہ نماز کے لیے مسجد میں آیا کریں۔نماز سے فارغ ہو کر وہ کھانا کھاتے اور پھر وہ گاؤں کے لڑکوں کے ساتھ باہر نکل جاتے اور کھیتوں کی نرم مٹی پر کبڈی کھیلتے کبھی کبھی گاؤں کے نوجوان بھی چاندنی راتوں میں کبڈی کھیلا کرتے تھے اور بڑی عمر کے لوگ انہیں دیکھنے کے لیے آجایا کرتے تھے یہ گاؤں افضل اور شیر سنگھ کی بدولت دیہاتی کھیلوں میں کافی نام پیدا کر چکا تھا۔کبھی کبھی پڑوس کے دیہات کے نوجوان بھی کھیل میں حصہ لینے کے لئے آتے تماشائیوں کی نگاہیں ایسے اجتماعات میں اسماعیل کو تلاش کرتیں اور جب اسماعیل آجاتا تو چودھری رمضان کا وہاں ہونا اشد ضروری خیال کیا

جاتا۔ کھیلنے والے کھیلتے، لیکن دیکھنے والوں کی زیادہ تر توجہ اسماعیل پر مرکوز رہتی۔ جب کوئی قہقہہ بلند ہوتا تو کھیلنے والوں کی توجہ بھی اسماعیل کی طرف مبذول ہو جاتی۔ ایسے موقعوں پر چھوٹی عمر کے لڑکے الگ کھیلتے۔ سلیم، مجید کے گاؤں کے بہترین کھلاڑیوں میں شمار ہوتا تھا اور اسے کبڈی کے ساتھ بے حد دلچسپی تھی لیکن جب اسماعیل آ جاتا تو وہ کھیل کی بجائے قہقہوں میں شریک ہونے کے لیے اس کے قریب آ بیٹھتا۔

کچھ عرصہ سے اپنے گھر کے ماحول کے ساتھ سلیم کی دلچسپی اور زیادہ ہو چکی تھی۔ چچا افضل کی گھوڑی کا دوسرا بچھیرا اب قد آور گھوڑا بن رہا تھا اور جب سلیم پرائمری سکول میں پڑھا کرتا تھا تو افضل نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ میری گھوڑی نے اگر دوسرا بچھیرا دیا تو وہ تمہارا ہو گا۔ گھر میں سواری کے لیے اور گھوڑے بھی موجود تھے، لیکن اس بچھیرے کے ساتھ سلیم کی دلچسپی جنون کی حد تک پہنچ چکی تھی۔ وہ گھر کے ہر آدمی کا ہاتھ پکڑ کر اصطبل میں لے جاتا اور بچھیرے کی طرف اشارہ کر کے کہتا ''دیکھو! اس کا رنگ کیسا ہے، اس کے بال کیسے ہیں۔ دیکھو یہ میری آواز سن کر کان کھڑے کر لیتا ہے'' چودھری رمضان کو عربی نسل کے گھوڑے پہچاننے میں خاص مہارت تھی سلیم بچھیرے کا رسا پکڑ کر اس کے گھر لے جاتا اور اس سے کہتا ''دیکھو چچا میرا گھوڑا عربی نسل کا ہے نا؟'' اور چودھری رمضان اپنی دانشمندی کا ثبوت دینے کے لیے اٹھ کر بچھیرے کے گرد ایک چکر لگاتا، پھر جھک کر اس کے سم دیکھتا، پھر اس کے کان ٹٹولتا، اس کی پیٹھ پر دو چار تھپکیاں دیتا اور بالآخر اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیر کر

کہتا ''بھئی ہے تو عربی'' اور سلیم خوشی سے پھولے نہ سماتا جب واپس آتا تو چودھری رمضان اسے آواز دے کر ٹھہرالیتا اور کہتا ''دیکھو برخوردار! یہ بہت جلدی بڑھ رہا ہے تم اسے کیا کھلایا کرتے ہو؟''

''چچا میں اسے چنے کھلایا کرتا ہوں''

وہ کہتا ''چنے اچھے ہوتے ہیں لیکن اسے کہیں بھینس کا دودھ نہ پلادینا!''

''بھینس کے دودھ سے کیا ہوتا ہے چچا؟''

''بڑی بے عزتی ہوتی ہے بیٹا! بھینس کے دودھ پینے والا گھوڑا کبھی کبھی سوار سمیت کیچڑ میں لیٹ جاتا ہے۔''

گھر کی عورتوں اور لڑکیوں کو ایک مذاق ہاتھ آ گیا تھا وہ صرف اتنا کہہ دیتیں کہ سلیم تمہارے گھوڑے میں یہ نقص ہے اور سلیم آپے سے باہر ہو جاتا۔ ایک دن وہ سکول سے آیا گھر کی چند عورتیں چرخہ کات رہی تھیں اس کی چچی نے کہا ''سلیم میں نے سنا ہے کہ تمہارے گھوڑے کے کان گدھے کی طرح بڑھتے جا رہی ہیں کہیں وہ بڑا ہو کر سچ مچ گدھا نہ بن جائے؟''

سلیم بستہ پھینک کر سیدھا مویشی خانے پہنچا وہ بچھیرے کے کانوں کا معائنہ کر رہا تھا کہ امینہ اس کے قریب پہنچ کر ہنسنے لگی ''امینہ کی بچی ٹھہرو!'' یہ کہہ کر وہ اس کی طرف بھاگا امینہ چیختی چلاتی دادی کے قریب جا پہنچی۔

سلیم کی چچی نے پھر ہنستے ہوئے کہا ''کیوں سلیم! دیکھے اس کے کان؟'' اور سلیم نے کوئی جواب دیے بغیر آگے بڑھ کر اس کے چرخے کا تکلا دوہرا کر دیا اور ہنستا ہوا

باہر نکل گیا۔

سکول جانے سے پہلے سلیم ہر روز امینہ سے کہا کرتا تھا ”دیکھو امینہ! اگر رات کو مجھ سے کہانی سننی ہے تو میرے گھوڑے کا خیال رکھنا!“ اور امینہ کہانی سننے کے شوق میں اس باق کا خیال رکھتی کہ سلیم کے گھوڑے کی کھرلی میں گھاس کم نہ ہو اور اس سامنے پانی کی بالٹی ہر وقت موجود رہے۔

یہ بچھیرا گھر کے آدمیوں اور بچوں سے جس قدر مانوس تھا، اسی قدر باہر کے آدمیوں سے نفرت کا اظہار کرتا تھا اگر کوئی اجنبی اسے دیکھنے کے لیے آتا تو وہ اسے کاٹنے یا دولتی مارنے کی کوشش کرتا، تاہم افضل کا خیال تھا کہ آہستہ آہستہ اس کی یہ عادت جاتی رہے گی۔



ایک دن سلیم اور اس کے ساتھی سکول سے آ رہے تھے۔ گاؤں کے قریب پہنچ کر اس کا دل خوشی سے اچھل پڑا۔ افضل اس کے گھوڑے پر سوار ہو کر کھیت میں چکر لگا رہا تھا اور چودھری رمضان اور گاؤں کے چند آدمی پاس کھڑے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

سلیم یہ دیکھتے ہی بھاگا اور مجید اس کے پیچھے ہو لیا۔ افضل کے قریب پہنچ کر سلیم نے بلند آواز میں کہا ”چچا جان! چچا جان!!“

افضل گھوڑا روک کر سلیم کی طرف متوجہ ہوا اور مسکرا کر کہنے لگا ”ہم نے تمہارے

گھوڑ کو لا دو کر دیا ہے جاؤ! بھابی جان سے کہو کہ ہمیں مٹھائی کھلائیں''

سلیم نے آگے بڑھ کر گھوڑے کی گردن پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا ''چچا جان! آج میں بھی سواری کروں گا اس پر!''

افضل نے گھوڑے سے اترتے ہوئے کہا ''نہیں بیٹا! ابھی نہیں ابھی یہ بہت سرکش ہے میں چند دنوں میں اسے ٹھیک کر دوں گا آج تو یہ مجھے بھی گرا دینا چاہتا تھا!''

سلیم نے کہا ''چچا جان میں نہیں گروں گا''

چودھری رمضان نے کہا ''برخوردار! افضل ٹھیک کہتا ہے تم ضد نہ کرو!'' سلیم نے مایوس ہو کر افضل کی طرف دیکھا اور سوال کیا ''چچا جان! یہ کب تک ٹھیک ہو جائے گا؟''

''پندرہ بیس دن میں بالکل ٹھیک ہو جائے گا اس کے بعد تمہیں اس پر چڑھنے کی اجازت ہو گی۔۔۔ اچھا بیٹا! اب تم اسے گھر لے جاؤ!''

سلیم نے گھوڑے کی باگ پکڑ لی اور اپنا بستہ مجید کے ہاتھ میں دے دیا۔

راستے میں مجید نے کہا ''سلیم مجھے بھی چڑھنے دیا کرو گے اپنے گھوڑے پر؟''

سلیم نے کہا ''میں نے چچا سے اسی لیے تو لیا ہے کہ ہم دونوں اس پر سواری کیا کریں''

مجید نے کہا ''ہم کسی اور کو نہیں چڑھنے دیں گے۔ چچا افضل نے مجھ سے بھی وعدہ کیا ہے کہ اس سال ان کی گھوڑی جو بچھیرا دے گی، وہ مجھے ملے گا''

’’لیکن مجھے اسے بھینس کا دودھ نہ پلانا!‘‘

’’واہ جی میں بھی کوئی چودھری رمضان ہوں‘‘

سلیم نے کہا’’مجید! میں چچا افضل سے ڈرتا ہوں ورنہ آج ہی اس پر سواری کروں‘‘

’’نہیں نہیں! سلیم تم گر جاؤ گے!‘‘

’’نہیں! یہ گھوڑا مجھے کبھی نہیں گرائے گا!‘‘

’’میں تمہیں آج نہیں چڑھنے دوں گا اس پر چچا افضل مجھے بھی ماریں گے!‘‘

سلیم نے کہا’’میں خود ہی آج اس پر سوار نہیں ہونا چاہتا ورنہ تم مجھے نہیں روک سکتے!‘‘

’’کیوں نہیں روک سکتا میں تمہیں روکوں گا!‘‘

’’بھلا تمہارا خیال ہے یہ مجھے گرا دے گا؟‘‘

’’ہاں!‘‘

’’اگر تم اس پر چڑھو تو تمہیں بھی گرا دے گا یہ؟‘‘

’’یہ مجھے کیسے گرا سکتا ہے!‘‘

سلیم نے کچھ سوچ کر کہا’’اگر میں اسے تیز نہ بھگاؤں تو بھی مجھے یہ گرا دے گا؟‘‘

مجید نے جواب دیا’’تم نہ بھگاؤ گے تو بھی یہ تیز بھاگے گا جانور کو یہ عقل تو نہیں ہوتی کہ اس پر ایک بچہ بیٹھا ہوا ہے!‘‘

سلیم نے بگڑ کر کہا ''میں بچہ نہیں ہوں''

مجید نے اطمینان سے جواب دیا ''چچا افضل نے تمہیں اسی لیے تو روکا ہے کہ تم ابھی بچے ہو۔تم اتنے بڑے گھوڑے کی لگام بھی نہیں کھینچ سکتے۔''

سلیم نے کوئی جواب نہ دیا اور مجید کو یقین ہو گیا کہ اب اگر اس نے زیادہ بات کی تو وہ اس کے ساتھ لڑ پڑے گا اس لیے وہ خاموشی سے چلتا رہا۔

پانی کی کھائی کے کنارے سبز گھاس اگی ہوئی تھی گھوڑا سر جکا کر گھاس کے تنکے نوچنے لگا،کھوئی عبور کرنے کے بعد چند قدم آگے جا کر مجید نے مڑ کر سلیم کی طرف دیکھا اور کہا ''آؤ سلیم!''

سلیم نے گھوڑے کی باگ کھینچ کر اسے کھائی میں ڈال دیا اور اچانک کنارے پر سے کود کر اس کی پیٹھ پر سوار ہو گیا۔

مجید چلایا ''بے وقوف تم گر پڑو گے!''

گھوڑا کود کر باہر نکلا اور چند بار اچھلنے کودنے اور پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہونے کے بعد ایک طرف بھاگ نکلا سلیم نے اسے چمکارتے ہوئے باگ کھینچی گھوڑا رک گیا سلیم نے اسے دوبارہ کھائی کے قریب لا کر کہا'' دیکھا مجید! میں بچہ نہیں ہوں، میرے ہاتھ باگ کھینچ سکتے ہیں اور میں گروں گا بھی نہیں۔''

اور پیشتر اس کے کہ مجید کچھ کہتا، وہ گھوڑے کی باگ موڑ کر اسے ایڑ لگا چکا تھا، گھوڑا سرپٹ بھاگا اور آن کی آن میں چند کھیت دور نکل گیا۔افضل نے دور سے اسے دیکھا، تو تھوڑی دیر کے لیے اس کے پاؤں زمین کے ساتھ پیوست ہو کر رہ

گئے وہ چلایا ’’سلیم اسے روکو! بیوقوف گر جاؤ گے۔۔۔۔!‘‘ لیکن سلیم بہت دور جا چکا تھا کوئی آدھ میل دور جا کر سلیم نے گھوڑے کی باگ موڑ لی سلیم کو صحیح سلامت واپس آتا دیکھ کر افضل کا غصہ جا چکا تھا لیکن جب سلیم نے اسے قریب آ کر گھوڑا روکنے کی بجائے اس کی باگ دائیں طرف موڑ دی تو افضل اپنی پوری طاقت کے ساتھ چلایا ’’گھوڑے کو بائیں طرف موڑ لو، آگے بہت بڑی کھائی ہے!‘‘

کھائی میں نہر کا پانی بہتا تھا اور وہ قریباً چھ فٹ چوڑی اور دو فٹ گہری تھی، کنارے ذرا اونچے تھے، تاہم سلیم کو اس کے اوپر کودنے میں کوئی خطرہ نظر نہ آیا۔ چچا افضل کی گھوڑی کو اس نے کئی بار اس نالی پر اسے کودتے ہوئے دیکھا تھا اور مجید کی چھوٹے قد کی گھوڑی بھی اسے پھاند جایا کرتی تھی۔ چنانچہ سلیم نے گھوڑے کو موڑنے یا روکنے کی بجائے اس کی رفتار اور تیز کر دی۔

چودھری رمضان کا لڑکا جلال کھائی میں نہا رہا تھا وہ گھوڑے کی آہٹ سن کر کھڑا ہو گیا اور دونوں ہاتھ بلند کر کے شور مچانے لگا گھوڑا اچانک بدک کر ایک طرف مڑا سلیم اس کی ننگی پیٹھ پر توازن قائم نہ رکھ سکا اور لڑھک کر زمین پر آ رہا۔

گھوڑے سے گرنا سلیم کے لیے ایک معمولی بات تھی اس نے سواری کے شوق میں اس سے پہلے بھی کئی چوٹیں کھائی تھیں اور وہ ہر بار ہنستا ہوا اٹھا کرتا تھا لیکن اس دفعہ چچا افضل نے اسے اٹھایا تو وہ درد سے کراہ رہا تھا۔ افضل شاید اسے غصے کی حالت میں پیٹ ڈالتا لیکن سلیم کا چہرہ دیکھ کر اس کا غصہ تشویش میں تبدیل ہو چکا تھا اس نے کہا ’’چوٹ تو نہیں آئی تمہیں؟‘‘

''نہیں چچا جان!''سلیم نے اپنی کہنی پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا

افضل کو اب غصہ آرہا تھا، اس نے اپنا لہجہ بدل کر کہا ''بہت بیوقوف ہو تم!''

گھوڑا تھوڑی دور جا کر کھڑا ہو گیا چودھری رمضان اسے پکڑنے کے لیے بھاگا لیکن گھوڑے نے اس کی طرف دیکھتے ہی اپنے اگلے سم اٹھا لیے رمضان بدحواس ہو کر الٹے پاؤں پیچھے بھاگا۔افضل نے اطمینان سے آگے بڑھ کر گھوڑے کی باگ پکڑ لی اور دوبارہ سلیم کے پاس آکر کہا ''لو اب اس پر پھر سوار ہو جاؤ!''

سلیم نے ندامت سے گردن جھکا لی افضل نے کہا ''بس ایک بار گرنے سے ڈر گئے؟ اب چڑھتے کیوں نہیں اس پر؟ گھوڑے کے دل میں یہ خیال نہیں آنا چاہیے کہ اس کا سوار بزدل ہے۔''

افضل نے سلیم کو بازو سے پکڑ کر اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی لیکن وہ درد سے کراہتا ہوا زمین پر بیٹھ گیا۔

افضل نے پریشان ہو کر کہا ''تمہیں چوٹ آئی ہے سلیم؟''

سلیم نے جواب دیا ''چچا۔۔۔۔میرا بازو۔۔۔۔!''

چودھری رمضان نے سلیم کے قریب بیٹھ کر اس کے بازو پر ہاتھ رکھتے ہی فتویٰ دے دیا کہ بازو کی ہڈی ٹوٹ چکی ہے۔

اتنی دیر میں کئی اور آدمی جمع ہو چکے تھے افضل نے گھوڑا کسی کے حوالے کیا اور سلیم کو اپنے بازوؤں میں اٹھانے کی کوشش کی سلیم اگرچہ رمضان کا فتویٰ سننے کے بعد بازو کی چوٹ کو زیادہ شدت سے محسوس کر رہا تھا۔تاہم اس نے کہا ''چچا! میں چل سکتا

ہوں۔"

افضل نے اس کی بغل میں ہاتھ دے کر سہارا دیا اور وہ آہستہ آہستہ چلنے لگا۔

گھر پہنچتے ہی سلیم کو بستر پر لٹایا گیا لیکن اپنے گرد خاندان اور پڑوس کی عورتوں کا ہجوم دیکھ کر وہ بار بار اٹھنے کی کوشش کرتا سلیم کی دادی ہاتھ میں دودھ کا کٹورا لیے التجا کر رہی تھی "بیٹا اسے پی لو! میرے لال اسے پی لو!" سلیم نے غصے میں ہاتھ مار کر کٹورا اس کے ہاتھ سے گرا دیا لیکن وہ دوسرا کٹورا بھر لائی سلیم نے مجبورا! چند گھونٹ پیے لیکن وہ بھرا ہوا کٹورا پلانے پر مصر تھی۔



چودھری رحمت علی نے آ کر کہا "کیا شور مچا رکھا ہے تم نے بچوں کو چوٹیں لگا ہی کرتی ہیں سلیم کے بازو پر معمولی چوٹ آئی ہے، میں نے اسماعیل کو فجو پہلوان کے پاس بھیج دیا ہے وہ آ کر ابھی ٹھیک کر دے گا۔"

لیکن دادی جان کو یہ سننا گوارا نہ تھا کہ سلیم کے جسم پر خراش آئے اور کوئی اسے معمولی بات کہہ کر ٹال دے اس نے کہا "آپ دیکھتے نہیں، بچے کا رنگ کس طرح پیلا ہو رہا ہے۔ میں اس منحوس گھوڑے کو گھر میں نہیں رہنے دوں گی!"

سلیم نے اچانک اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا "نہیں دادی جان! گھوڑے کا کوئی قصور نہیں وہ ڈر گیا تھا۔"

رحمت علی نے کہا "اگر مرد تم عورتوں کا کہا مانتے تو گھوڑے پر کوئی سواری نہ کرتا

اور شاید بیلوں کو ہل میں جوتنے کی بجائے بھی وہ اپنے ہی گلے میں رسا ڈال لیا کرتے۔''

اتنے میں رمضان کی بیوی آ گئی اور بولی ''ہائے میرے اللہ! یہ کیا ہو گیا! جلال کا باپ کہتا ہے کہ سلیم کے بازو کی ہڈی بالکل ٹوٹ گئی ہے!''

یہ سنتے ہی دادی اماں نے آسمان سر پر اٹھا لیا پڑوس کی اور بہت سی عورتیں بھی جمع ہو گئیں۔

اسماعیل، فجو پہلوان کو لے کر آ گیا چودھری رمضان بھی ان کے ساتھ تھا۔ اور مصر تھا کہ بازو کی ہڈی ٹوٹ چکی ہے اور اس کا علاج صرف شہر میں ہو سکے گا اور سلیم کی دادی اسے اپنے پوتے کا سب سے بڑا ہمدرد سمجھ رہی تھی۔

فجو پہلوان نے اپنے سلیم کا بازو ٹٹول کر اسے درد سے کراہنے پر مجبور کیا۔ پھر ہلا جلا کر سلیم کی چیخیں نکالیں اس کے بعد گرم تیل کی مالش کی اور روئی باندھ دی۔

چودھری رحمت علی نے پوچھا ''کیوں فجو کوئی خطرے کی بات تو نہیں؟''

فجو نے تسلی دیتے ہوئے کہا ''نہیں چودھری جی! جوڑ ذرا ہل گیا ہے۔ چند دن میں ٹھیک ہو جائے گا۔ میں صبح پھر آؤں گا اسے چند دن کے لیے چلنے پھرنے کی اجازت نہ دیں، ورنہ جوڑ پھر ہل جائے گا۔''

رات کے وقت سلیم کو معلوم ہوا کہ دادی اماں نے نوکر کو حکم دے دیا ہے کہ وہ سلیم کے گھوڑے کے آگے چنے نہ ڈالے جب ماں نے سلیم کے آگے کھانا لا کر رکھا تو وہ روٹھ کر بیٹھ گیا ماں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور جھک کر آہستہ سے اس کے

کان میں کہا "میں نے تمہارے گھوڑے کے لیے چنے بھجوا دیے ہیں۔"

سلیم نے کہا "امی! دادی جان کہتی ہیں کہ وہ گھوڑے کو گھر سے نکال دیں گی؟"

ماں نے تسلی دیتے ہوئے کہا "نہیں بیٹا! جب تمہارا بازو ٹھیک ہو جائے گا تو ان کا غصہ بھی اتر جائے گا۔"

☆☆☆☆☆

پیر ولایت شاہ کی اس علاقے میں بہت دھوم تھی امارت اور ولایت ان کے خاندان میں برسوں سے چلی آ رہی تھی ان کی زمینیں تھیں، باغات تھے لیکن لوگ جس بات پر بہت زیادہ مرعوب تھے، وہ ان کے خاندان کا قبرستان تھا جس کی تمام قبریں سنگ مرمر کی بنی ہوئی تھیں ان کے جد امجد کے مزار کا گنبد پانچ میل سے دکھائی دیتا تھا۔

پیر ولایت شاہ چار بار میٹرک کے امتحان میں فیل ہوئے تھے تاہم اپنے باپ کی بے وقت وفات پر وہ روحانی کاروبار سنبھالنے پر مجبور نہ ہو جاتے تو یقیناً علم کے دریائے ناپیدا کنار میں چند برس اور غوطے لگاتے۔ اب مریدوں کو پل صراط کے اوپر سے بخیر و عافیت گزارنے کا کام ان کے ذمہ تھا اور پیر ولایت شاہ پوری تن دہی سے اپنے فرائض پورے کر رہے تھے۔ وہ فرزندان آدم کو ارضی و سماوی تکالیف سے نجات دلانے کے لیے تعویذ لکھا کرتے تھے اور اپنی فرصت کے تلخ لمحات کو خوشگوار بنانے کے لیے شطرنج کھیلا کرتے تھے، بھنگ پیا کرتے تھے، بٹیر لڑایا کرتے تھے،

شادیاں کیا کرتے تھے اور شادیوں کے بعد طلاقیں دیا کرتے تھے۔

ان کے پاس آٹھ دس گھوڑے تھے۔ پانچ چھ خچر اور پندرہ بیس کتے تھے۔ سال میں ایک بار وہ شاہانہ جاہ وجلال کے ساتھ دورے پر نکلا کرتے تھے۔ تیس چالیس پیدل اور سوار چیلے ان کے ساتھ ہوتے، مریدوں کا حلقہ اس قدر وسیع تھا کہ انہیں ایک ایک دن میں کئی کئی ضیافتیں کھانا پڑتیں۔ ہراول کی ایک ٹولی پہلے ہی مریدوں کو خبر دار کر دیتی کہ پیر صاحب آج تمہارے ہاں قیام کریں گے۔

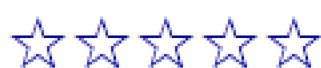
پیر صاحب کا طعام تو خیر اتنی بڑی مصیبت نہ تھی لیکن جس بدنصیب کے ہاں وہ ایک دو دن قیام کرتے اس کا دیوالہ نکل جاتا۔ اس کی لہلہاتی گندم گھوڑوں کی نذر ہو جاتی۔ اس کے باغ کا کچا پکا پھل پیر صاحب کے چیلوں کے شکم کا ایندھن بن جاتا رخصت کے وقت پیر صاحب نذرانہ وصول کرتے اور چیلے مرید کے گھر سے فالتو برتن اور کپڑے اٹھا لیتے۔

جب پیر صاحب دوسری گاؤں کا رخ کرتے تو مرید کسی بلند ٹیلے پر کھڑا ہو کر آسمان کی طرف دیکھتا اور کہتا ''یا پروردگار! آندھی آئے، طوفان آئے، زلزلہ آئے، سورج سوا نیزے پر آئے لیکن پیر ولایت شاہ دوبارہ نہ آئے۔''

کچھ عرصہ سے علاقے کے سمجھ دار لوگوں میں پیر ولایت شاہ کے متعلق عام بے چینی پائی جاتی تھی اور اس بے چینی کی وجہ یہ تھی کہ پیر صاحب ایک لڑکی کو آسیب سے نجات دلا کر خود اس کے لیے آسیب بن گئے تھے۔ تاہم دیہات کے ان پڑھ لوگوں کی ایک بڑی تعداد پیر ولایت شاہ کے زیر اثر تھی۔ تکیوں میں بھنگ، پوست اور

چرس پینے والے سائیں لوگ انہیں اپنا پیشوا مانتے تھے۔ ان لوگوں نے مشہور کر رکھا تھا کہ خدا نے ولایت شاہ کی زبان میں وہ تاثیر ی ہے کہ وہ جسے بد دعا دیتا ہے، اس کے مویشی مر جاتے ہیں۔ فصل برباد ہو جاتی ہے۔ عورتیں بانجھ ہو جاتی ہیں اور بچے طرح طرح کے امراض میں مبتلا ہو جاتے ہیں اس کے علاوہ لوگوں نے ولایت شاہ کو جنوں، بھوتوں اور چڑیلوں سے باتیں کرتے دیکھا ہے۔ خدا کی یہ عجیب و غریب مخلوق جو عام انسانوں کو نظر نہیں آتی، ان کے اشاروں پر ناچتی ہے، ایک جن ان کے لیے رات کے وقت بلا ناغہ پھل اور مٹھائیاں لے کر آتا ہے، دوسرا ان کا بستر بچھاتا ہے اور تیسرا ان کے پاؤں دباتا ہے۔ جب ولایت شاہ جلال میں آتے ہیں تو ایک خوفناک جن کو حکم دیتے ہیں کہ جاؤ فلاں شخص کا گلا گھونٹ آؤ اور وہ کسی حیل و حجت کے بغیر ان کے حکم کی تعمیل کرتا ہے۔ اس قسم کا پروپیگنڈہ ان دیہات میں زیادہ موثر ہوتا جہاں تعلیم یافتہ لوگوں کی کمی ہوتی۔

مردوں کی نسبت دیہاتی عورتیں پیر ولایت شاہ سے کہیں زیادہ متاثر تھیں۔ ولایت شاہ کے پاس قسم قسم کے تعویذ اور گنڈے تھے اور عورتوں کو ہمیشہ ان چیزوں کی ضرورت رہتی تھی بیمار بچوں کی صحت کے لیے، آسیب زدہ لڑکیوں اور لڑکوں کی نجات کے لیے اور دوسری شادی کی خواہش کرنے والے خاوند کو راہ راست پر لانے کے لیے ان تعویذوں اور گنڈوں کی ضرورت رہتی تھی۔



سلیم کے گاؤں میں چند آدمی پیر ولایت شاہ کے مرید تھے۔ان مریدوں میں چودھری رمضان ان پر دل و جان سے فدا تھا اور اس کی عقیدت بلاوجہ نہ تھی، وہ جنوں، بھوتوں اور چڑیلوں سے بہت پریشان رہتا تھا اور اس پریشانی کو دور کرنے کے لیے ولایت شاہ نے اسے تعویذ دیا تھا جنوں اور بھوتوں کے بعد وہ پولیس سے بہت ڈرتا تھا، چنانچہ اس کے گھر سے پولیس کو دور رکھنے کے لیے ولایت شاہ نے اسے دوسرا تعویذ دیا تھا یہ دونوں تعویذ وہ ہمیشہ اپنے گلے میں باندھے رکھتا تھا۔

چودھری رمضان کے اصرار پر ایک دفعہ پیر ولایت شاہ اس گاؤں آئے تھے اور اس کے بعد انہوں نے قسم کھالی تھی کہ وہ دوبارہ اس گاؤں میں قدم نہیں رکھیں گے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ ان دنوں سلیم کا والد چودھری علی اکبر بھی چھٹی پر آیا ہوا تھا۔ ولایت شاہ کو معلوم نہ تھا کہ اس گاؤں میں اس کی علی اکبر سے ملاقات ہوگی ورنہ وہ کبھی نہ آتا۔علی اکبر اسے طالب علمی کے زمانے سے جانتا تھا اس نے دیکھتے ہی کہا ''ارے ولایت! میں تو سمجھتا تھا کہ تم ابھی تک سکول میں ہو گے۔۔۔سناؤ اس سال کتنی شادیاں کی ہیں؟''

ایک دیرینہ واقف کار کی طرف سے یہ صرف ابتدا تھی علی اکبر نے سکول کی باتیں شروع کر دیں لوگ ہنس رہے تھے لیکن مرید انگاروں پر لوٹ رہے تھے۔رمضان کو پیچ وتاب کھاتا دیکھ کر اسماعیل کی رگ ظرافت پھڑک اٹھی اس نے کہا ''جنوں نے پیر صاحب کو پھل اور مٹھائیاں کھلا کر بہت موٹا کر دیا ہے۔آج ان کے گھوڑے کی کمر دوہری ہو رہی تھی۔ابھی خدا کے فضل سے یہ جوان ہیں لیکن خدا کے حضور پہنچتے پہنچتے

ان کا وزن ڈیڑھ دو من اور زیادہ ہو جائے گا۔ میں سوچتا ہوں کہ یہ پل صراط سے کیسے گزریں گے ان کا بوجھ اٹھانے کے لیے تو مال گاڑی کی ضرورت پڑے گی!''

ولایت شاہ کے دماغ پر اگر بھنگ کا نشہ غالب نہ ہوتا تو وہ یقیناً جلال میں آ جاتے تاہم چودھری رمضان کا پیمانہ صبر لبریز ہو چکا تھا اس نے کہا ''اسماعیل تحصیل دار تو بھلا پیر جی کا لنگوٹیا ہے لیکن تمہیں ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔''

بزرگوں کے منہ سے کبھی بری دعا بھی نکل جاتی ہے!

اتنی دیر میں چودھری رحمت علی رمضان کے صحن میں داخل ہو چکا تھا۔ اس نے کہا ''اسماعیل! تم بڑے بے شرم ہو، ہر ایک سے مذاق شروع کر دیتے ہو۔''

علی اکبر نے کہا ''ابا جی! اسماعیل تو ان کے فائدے کی بات کہہ رہا تھا۔ پیر جی بہت زیادہ موٹے ہو گئے ہیں، ان کو ورزش کرنی چاہیے۔''

رحمت علی کو بھی ولایت شاہ سے کوئی عقیدت نہ تھی تاہم وہ اس کے بزرگوں سے مرعوب تھا اور اسے یہ بات گوارا نہ تھی کہ اس خاندان کا گدی نشین خواہ وہ برا ہی کیوں نہ ہو، اس کے بچوں کو بد دعا دے کر جائے۔ اس نے اپنے لڑکوں کو ڈانٹ ڈپٹ کر وہاں سے نکال دیا اور پیر جی سے کہا ''شاہ جی! آپ غصہ نہ کریں میرے دل میں آپ کے بزرگوں کی بڑی عزت ہے۔''

شاہ جی نے غصے کا اظہار تو نہ کیا لیکن دل میں یہ فیصلہ ضرور کر لیا کہ وہ آئندہ اس گاؤں میں نہیں آئیں گے۔۔۔ چند دنوں کے بعد چودھری رحمت علی کے دو بیل چوری ہو گئے تو رمضان یہ کہتا پھرتا تھا کہ یہ ولایت شاہ کی بد دعا کا نتیجہ ہے، دو دن

کے بعد یہ بیل مل گئے تو رمضان نے یہ مشہور کر دیا کہ شاہ صاحب نے رحمت علی کے لڑکوں کا قصور معاف کر دیا ہے۔



عام حالات میں شاید ولایت شاہ دوبارہ اس گاؤں میں تشریف نہ لاتے لیکن چند سال بعد ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس کے باعث انہیں آنا ہی پڑا۔

جس دن سلیم گھوڑے سے گرا، اس سے تیسرے روز گاؤں کے لوگ ایک نئے موضوع پر تبصرے کر رہے تھے چودھری رمضان اپنی زندگی کی سب سے بڑی پریشانی کا سامنا کر رہا تھا عام طور پر گاؤں کے لوگ اس کی پریشانیوں پر قہقہے لگایا کرتے تھے لیکن اس دفعہ بعض لوگ اس غیر متوقع واقعہ پر سنجیدگی سے غور کر رہے تھے۔

بات یہ ہوئی کہ چودھری رمضان نے کچھ گندم دھوپ میں سوکھنے کے لیے اپنے کوٹھے کی چھت پر ڈال دی تھی۔ اس کوٹھے کے پچھواڑے کچھمن سنگھ کی حویلی تھی۔ کچھمن سنگھ کی حویلی کا جو کونا رمضان کے کوٹھے کے ساتھ لگتا تھا وہاں اس نے پیال کا ڈھیر لگا رکھا تھا۔ پیال کا یہ ڈھیر سال بھر میں بارشوں کی وجہ سے تھوڑا بہت دب جاتا تو کچھمن سنگھ اس پر اور پیال ڈال دیتا۔ کچھمن سنگھ اس ڈھیر سے کئی کام لیا کرتا تھا سردیوں کی دھوپ میں وہ اس ڈھیر پر بیٹھ کر چارپائی کا بان بٹا کرتا تھا۔ برسات میں جب حویلی میں کیچڑ ہوتی تو وہ اپنی بکریوں کے لیے وہاں چارہ ڈال دیا کرتا تھا

گرمیوں کی راتوں میں جب چودھری رمضان اپنے کوٹھے پر سویا کرتا تھا تو وہ اس کے پاس پہنچ کر گپیں مارنے کے لیے پیال کے اس ڈھیر سے سیڑھی کا کام لیا کرتا تھا گاؤں میں اگر کسی کو پیال کی ضرورت ہوتی تو بلا تکلف یہاں سے لے سکتا تھا اس لیے چھمن سنگھ کی کوشش ہوتی کہ اس ڈھیر کی سطح رمضان کے کوٹھے سے نیچے نہ ہونے پائے۔

جس دن رمضان نے کوٹھے پر گندم ڈالی تھی، چھمن سنگھ نے اپنی بکریاں باندھ لی تھیں لیکن اس کا بھینسا کسی طرح کھل گیا اور خدا معلوم اسے کیا سوجھی کہ وہ پیال کے ڈھیر پر سے گزرتا ہوا چودھری رمضان کے کوٹھے پر جا پہنچا۔

چودھری رمضان اندر بیٹھا روٹی کھا رہا تھا کہ اوپر کھڑکھڑاہٹ سنائی دی مٹی گری اور اس کے ساتھ ہی چھت سے یکے بعد دیگرے دو سیاہ ٹانگیں نمودار ہوئیں۔ بھینسے کی ٹانگیں۔

میاں بیوی سکتے کے عالم میں ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے باہر سے جلال اور اس کی بہن نے دہائی مچا دی ''ماں! چھمن سنگھ کا بھینسا کوٹھے پر چڑھ گیا۔''

رمضان کسی بہت خطرناک جس کا تصور کر رہا تھا۔ وہ ہانپتا، کانپتا اور لرزتا ہوا باہر نکلا تھوڑی دیر دم لینے کے بعد وہ لکڑی کی سیڑھی سے اوپر چڑھا۔ چھمن سنگھ کے بھینسے کی گردن چھت کے ساتھ لگی ہوئی تھی اس کی اگلی دو ٹانگیں نیچے دھنس گئی تھیں۔ پچھلی ٹانگیں ابھی تک پیال کے ڈھیر پر تھیں۔ بے کسی اور انکساری کا یہ پیکر مجسم اپنی

خاموش نگاہوں سے چھت کی ناپائیداری کے خلاف احتجاج کر رہا تھا۔

چودھری رمضان نے تھوڑی دیر میں سارا گاؤں اکٹھا کر لیا بچوں اور نوجوانوں نے قہقہے لگائے لیکن بڑوں کے لیے یہ انہونی بات تھی بھینسے کو اس مصیبت سے نجات دلائی گئی اس کے بعد یہ سوال زیر بحث تھا کہ آدمؑ کے زمانے سے لیکر آج تک بھینسا کسی کوٹھے کی چھت پر نہیں چڑھا لیکن آج ایسا کیوں ہوا؟

گاؤں میں ایسے سوالات کا جواب صرف سائیں اللہ رکھا دیا کرتا تھا اس نے کہا ''یہ منگل کا دن ہے۔ بھینسا رمضان کے کوٹھے پر چڑھا ہے اور بھینسا پچھمن سنگھ کا ہے اب خدا فضل کرے، مجھے ڈر ہے کہ اول تو سارے گاؤں پر ورنہ ان دو گھروں پر ضرور کوئی نہ کوئی مصیبت ضرور آئے گی!''

رمضان اور پچھمن سنگھ سے پہلے ان کی بیویوں نے اس بات کی تائید کی پچھمن سنگھ کی بیوی اسے کہتی تھی کہ یہ بھینسا مفت کسی کو دے دو اور رمضان کی بیوی اپنے شوہر سے کہتی تھی کہ تم ابھی ولایت شاہ کے پاس جاؤ!

رات کے وقت جلال کے پیٹ میں درد ہوا اور پچھمن سنگھ کے کوٹھے پر دو کتے روتے رہے۔ چنانچہ پچھلے پہر رمضان نے گھر سے تیس روپے لیے اور پچھمن سنگھ نے اپنا بھینسا کھول لیا اور دونوں ولایت شاہ کی طرف چل دیے پچھمن سنگھ کو راستے میں ایک خریدار مل گیا اور اس نے تیس روپے کے عوض بھینسا اس کے پاس فروخت کر دیا۔ ولایت شاہ کے پاس پہنچ کر رمضان نے بیس روپے ان کے آگے رکھ دیے۔ پچھمن سنگھ اس سے زیادہ فیس ادا کرنے کے لیے تیار نہ تھا چنانچہ اس نے بھی بیس

دے دیے اور دس شراب کے لیے اپنے پاس رکھ لیے۔

دونوں نے ہاتھ باندھ کر اپنی مصیبت کا حال سنایا ولایت شاہ اس وقت بھنگ کے نشہ میں تھا۔ اس نے کہا ''اچھا بھئی! میں نے تو ارادہ کیا تھا کہ اس گاؤں میں دوبارہ پاؤں نہیں رکھوں گا، پر اب تم آ گئے ہو تو مجھے جانا ہی پڑے گا۔ وہ جن جس نے بھینسا اٹھا کر تمہاری چھت پر رکھ دیا تھا معمولی جن نہیں۔۔۔۔تم نے بہت اچھا کیا، اس بھینسے کو بیچ دیا اب وہ جس کے گھر جائے گا، اس کا ستیاناس ہوگا۔''



شام کے چار بجے کے قریب جب چودھری رمضان اور لچھمن سنگھ پیر ولایت شاہ کو لے کر گاؤں کے قریب پہنچے تو افضل کھیتوں میں گھوڑا دوڑا رہا تھا۔ پیر ولایت شاہ اپنا گھوڑا روک کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کے ساتھ چار مجاور تھے۔ انہوں نے بھی اپنے گھوڑوں کی باگیں کھینچ لیں۔

پیر ولایت شاہ نے رمضان سے پوچھا ''یہ گھوڑے والا کون ہے؟''

اس نے جواب دیا ''یہ افضل ہے، چودھری رحمت علی کا لڑکا!''

''کتنے کا خریدا ہے یہ گھوڑا؟''

''پیر جی یہ ان کے گھر کا بچھیرا ہے۔ خالص عربی نسل کا ہے دیکھیے اب وہ کھائی پر سے چھلانگ لگائے گا''

جس جگہ سے افضل گھوڑے کو چھلانگ لگوا رہا تھا، وہاں سے کھائی کا پاٹ کافی

چوڑا تھا۔ گھوڑے کی چند چھلانگیں دیکھنے کے بعد ولایت شاہ نے کہا ’’کیوں چودھری رمضان! وہ اس گھوڑے کو بیچتے ہیں یا نہیں؟‘‘

رمضان نے جواب دیا ’’پیر جی! اگر آپ کو خریدنے کا شوق ہو تو شاید ان کی دوسری گھوڑی کا سودا ہو جائے وہ اسی بچھیرے کی بہن ہے۔ بہت تیز بھاگتی ہے، ہے بھی بہت شریف۔ اس گھوڑے کو انہوں نے ابھی ابھی لگام دی ہے۔ ابھی تک یہ شوخ ہے دو تین دن ہوئے اس نے تحصیل دار کے لڑکے کو گرا دیا تھا۔‘‘

لیکن پیر صاحب فیل قامت ہونے کے باوجود سواری کے لیے شوخ جانور پسند کرتے تھے انہوں نے کہا ’’گھوڑیاں میرے پاس بہت ہیں، تم اس گھوڑے کا سودا کروانے کی کوشش کرو!‘‘

چودھری رمضان نے آگے بڑھ کر آواز دی ’’افضل! افضل! بھئی ادھر آنا!‘‘

لیکن افضل رمضان کی آواز سننے سے پہلے کھائی پر سے کود کر گھوڑے کی باگ گاؤں کی طرف موڑ چکا تھا۔

جب رمضان، ولایت شاہ کے گھوڑے کی باگ پکڑے ہوئے اپنے گھر کا رخ کر رہا تھا تو افضل گھوڑے کو اصطبل میں چھوڑ کر اپنی حویلی سے باہر نکلا۔

اس نے پیر صاحب کو دیکھ کر کہا ’’پیر صاحب! السلام علیکم!‘‘

پیر صاحب نے گرمجوشی سے سلام کا جواب دینے کے بعد کہا ’’بھئی چودھری ہم دیر تک تمہارا گھوڑا دیکھتے رہے لیکن تم نے ہماری طرف توجہ ہی نہ دی بھئی گھوڑا بھی اچھا ہے اور سوار بھی اچھا ہے چودھری علی اکبر یہیں ہے؟‘‘

''نہیں جی، شاید اگلے مہینے آئیں''

''چودھری رحمت علی کہاں ہیں؟''

''وہ شہر گئے ہوئے ہیں، شام تک آجائیں گے''

رمضان نے کہا ''پیر جی! بڑے چودھری لڑکوں کی باتوں میں دخل نہیں دیتے افضل جو بات کرے گا، انہیں منظور ہوگی''

افضل نے کہا ''کیا بات ہے چودھری رمضان؟''

پیر صاحب نے رمضان کو گھور کر دیکھا لیکن رمضان ایسے معاملات میں تمہید کا قائل نہ تھا اس نے کہا ''بھئی بات یہ ہے کہ پیر صاحب کو تمہارا گھوڑا پسند آگیا ہے اب تم یہ بتاؤ کہ لو گے کیا؟''

افضل کے لیے یہ ایک گالی تھی، تاہم اس نے پیر صاحب کا لحاظ کرتے ہوئے کہا ''یہ میرے بھتیجے کا ہے۔''

لچھمن سنگھ نے کہا ''بھئی اب پیر جی بچے کے ساتھ تو بات نہیں کریں گے!''

افضل نے کہا ''پیر جی یہ گھوڑا آپ کے کام کا نہیں اور ہم اسے بیچنا بھی نہیں چاہتے''

ولایت شاہ نے کہا ''بھئی ہم ادھار نہیں کرتے، نقد قیمت دیں گے!''

افضل فطرتاً شرمیلا تھا۔ وہ پیر صاحب کو ٹالنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن پیر صاحب قیمت چکانے پر بضد تھے اور رمضان اور لچھمن سنگھ پیر جی کی وکالت کر رہے تھے غلام حیدر اور اسماعیل بھی گھر سے نکل آئے اور گاؤں کے لوگ بھی وہاں جمع ہو گئے۔ سلیم

کو مجید نے خبردار کر دیا اور وہ اپنا بازو گلے کے ساتھ لٹکائے آہستہ آہستہ چلتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔

ولایت شاہ ان لوگوں میں سے تھے جو اپنی پسند کی کسی شے پر دوسروں کا حق تسلیم نہیں کرتے۔ ان کے خیال میں یہ گھوڑا خوبصورت تھا لہٰذا اس کا صحیح مقام ان کا اصطبل تھا۔ وہ یہ اعتراض سننے کے لیے تیار نہ تھے کہ اس کے ساتھ افضل کے بھتیجے کو دلچسپی ہے اور اگر یہ بیچ ڈالا گیا تو ایک معصوم لڑکے کا دل دکھے گا افضل اور اس کے بھائیوں کو اس کی ضد پر غصہ آ رہا تھا لیکن وہ ان کے دروازے کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کے علاوہ چودھری رمضان کی جان پر بنی ہوئی تھی۔ اس کے لیے یہ بات ناقابل برداشت تھی کہ پیر جی دوسری دفعہ اس کے گاؤں سے ناراض ہو کر جائیں۔ وہ ہاتھ جوڑ کر کہہ رہا تھا کہ خدا کے لیے پیر جی کو ناراض نہ کرو!

سلیم حیران تھا کہ اس کے گھوڑے کے متعلق بحث ہو رہی ہے لیکن اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتا۔

جب ولایت شاہ کو ٹالنا بہت مشکل ہو گیا تو اسماعیل نے کہا ”پیر جی! اگر اسی طرح کسی کو آپ کی گھوڑی پسند آ جائے تو آپ بیچ دیں گے؟“

پیر جی نے بگڑ کر کہا ”اگر کوئی قیمت دینے والا ہو تو میں ابھی اپنی گھوڑی بیچنے کے لیے تیار ہوں ۔۔۔۔ یہ خریدنے والے کی ہمت کی بات ہے اس کی قیمت چار سو روپیہ ہے۔“

اسماعیل نے کہا ”اگر آپ کی گھوڑی کی قیمت چار سو روپیہ ہے تو ہمارے

گھوڑے کی قیمت پانچ سو روپیہ ہے، اگر آپ میں ہمت ہے تو خرید لیں!''

پیر صاحب کا جوش وخروش تھوڑی دیر کے لیے ٹھنڈا پڑ گیا انہوں نے ادھر ادھر دیکھنے کے بعد کہا ''اچھا تمہاری طرف سے پانچ سو روپے کی بات پکی ہوئی اگر مجھ میں ہمت ہوئی تو میں خرید لوں گا، ورنہ تمہارا گھوڑا تمہیں مبارک ہو چلو چودھری رمضان!''

پیر صاحب نے رمضان کے گھر پہنچ کر اپنی مٹھی میں خشک مٹی اٹھائی، کچھ پڑھنے کے بعد اس پر پھونک ماری اور رمضان سے کہا ''یہ مٹی اپنے کوٹھے کی چھت پر بکھیر دو'' پھر پچھمن سنگھ کو ایک تعویذ لکھ کر دیا اور کہا ''اسے آدھی رات کے وقت اپنی حویلی میں دو بالشت گہرا گڑھا کھود کر دبا دینا'' اس کام سے فارغ ہو کر انہوں نے بھنگ پی، افیون کھائی اور بستر پر لیٹ کر حقے کی نے منہ میں ٹھونس لی چند کش لگانے کے بعد انہوں نے کہا ''رمضان، تمہیں عربی نسل کے گھوڑے کی پہچان ہے؟''

رمضان نے قدرے تذبذب کے بعد جواب دیا ''پیر جی! یہ گھوڑا تو واقعی عربی نسل کا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ بیچنا نہیں چاہتے۔''

''لیکن اب تو وہ بیچنے پر تیار ہو گئے ہیں''

''نہیں پیر جی، ان کا خیال ہے کہ آپ قیمت سے ڈر جائیں گے۔ اس لیے انہوں نے پانچ سو بتا دیا ہے۔''

پیر جی نے اچانک اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا ''میں پانچ سو روپیہ اپنے جوتے کے برابر بھی نہیں سمجھتا۔''

''ہاں پیر جی، پانچ سو روپیہ آپ کے لیے کیا چیز ہے!''

''اچھا جاؤ، ان سے بات پکی کرو، میں صبح گھوڑے کو اچھی طرح دیکھوں گا، اگر اس میں کوئی نقص نہ ہوا تو میں کل ہی پانچ سو روپیہ ادا کروں گا۔''



برگد کے درخت کے نیچے لوگ ابھی تک جمع تھے رمضان کا پیر موضوع بحث تھا۔ اس کے موٹاپے، اس کی مونچھوں کی لمبائی اور اس کی دستار کے طرے پر خیالات کا اظہار ہو رہا تھا چودھری رمضان بھاگتا ہوا آیا ''چودھری رحمت علی کہاں ہے؟'' اس نے کہا

چودھری رحمت علی نے حویلی کے پھاٹک سے نکلتے ہوئے کہا ''کیوں چودھری کیا بات ہے؟''

رمضان نے کہا ''مجھے پیر جی نے بھیجا ہے''

اسماعیل نے کہا ''بھئی ہم نے پیر صاحب کو قیمت بتا دی ہے''

رحمت علی نے کہا ''کس کی قیمت؟''

اسماعیل نے کہا '' ابا جی! رمضان کا پیر آیا ہے، وہ سلیم کا گھوڑا خریدنا چاہتا ہے افضل نے اسے بہت ٹالا لیکن یہ بھنگ کا نشہ بہت بُرا ہوتا ہے میں نے تنگ آ کر کہا کہ اگر گھوڑا خریدنے کا شوق ہے تو لاؤ پانچ سو روپیہ! پیر جی یہ سن کر چپکے سے چل دیے۔ اب انہوں نے رمضان کو آپ کے پاس بھیجا ہے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے

اور بھنگ پلا دی ہے۔‘‘

رمضان نے اسماعیل کو جواب دینے کی بجائے رحمت علی کی طرف متوجہ ہو کر کہا ’’چودھری جی! راجہ کے گھر موتیوں کا کال نہیں ہے۔ پیر جی کہتے ہیں کہ وہ صبح آ کر گھوڑے کو دیکھیں گے اور اگر گھوڑے میں کوئی نقص نہ ہوا تو وہ کل ہی آپ کو پانچ سو روپیہ ادا کر دیں گے انہیں خدا نے بہت کچھ دیا ہے۔ پانچ سو روپیہ کیا چیز ہے!‘‘

جس زمانے میں گندم ڈیڑھ روپے من تھی، پانچ سو روپیہ معمولی بات نہ تھی محفل پر تھوڑی دیر کے لیے سناٹا چھا گیا لیکن اسماعیل نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا ’’چودھری رمضان! سچ کہو، کتنی بھنگ پی ہے تمہارے پیر نے؟‘‘

رحمت علی نے اسماعیل کو ڈانٹتے ہوئے کہا ’’اسماعیل! تم ہر ایک کا مذاق نہ اڑایا کرو!‘‘ پھر وہ چودھری رمضان کی طرف متوجہ ہوا ’’جاؤ چودھری رمضان! اگر اسماعیل نے پانچ سو کے عوض گھوڑا بیچنے کا وعدہ کیا ہے تو صبح پیر صاحب کو لا کر دکھا دینا۔‘‘

رحمت علی یہ کہہ کر مسجد کی طرف چلا گیا۔ سلیم دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ کچھ دیر پہلے اسے اس بات کی تسلی ہو گئی تھی کہ بلا ٹل گئی لیکن رمضان کی باتیں سن کر اس کا چہرہ پھر مرجھا گیا۔

افضل نے سلیم کی طرف دیکھا اور پھر اسماعیل کی طرف متوجہ ہو کر کہا ’’اسماعیل ولایت شاہ کے پاس پیسہ بہت ہے اگر وہ ضد پر آ گیا تو یہ بری بات ہو گی سلیم دو تین بار رو چکا ہے!‘‘

اسماعیل نے کہا ''ارے یہ رمضان کی باتیں ہیں''

غلام حیدر نے کہا ''نہیں اسماعیل، سائیں اللہ رکھا کہتا ہے، کہ پیر صاحب کا اگر کسی چیز پر دل آ جائے تو وہ پیسوں کی پروا نہیں کرتے انہوں نے ایک کتا ساٹھ روپے میں خرید لیا تھا۔''

اسماعیل نے اٹھ کر سلیم کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ''بیٹا! تم فکر نہ کرو اول تو صبح تک پیر جی کا نشہ اتر جائے گا اور اگر اس نے یہ گھوڑا خرید ہی لیا تو میں پانچ سو روپے میں تمہارے لیے وہ گھوڑا لاؤں گا کہ دنیا دیکھے گی!''

سلیم نے اس کا ہاتھ جھٹکتے ہوئے کہا ''نہیں نہیں میں اپنا گھوڑا نہیں دوں گا۔ میں اپنا گھوڑا نہیں دوں گا۔ یہ میرا ہے، یہ میرا ہے۔''



رات کے وقت چونکہ دادا اور چچا یہ وعدہ نہ کر سکے کہ وہ صبح پیر جی کو اصطبل کے قریب نہیں آنے دیں گے، اس لیے سلیم نے کھانا نہ کھایا۔

دادی اماں جسے سلیم کو چوٹ لگنے کے بعد اس گھوڑے سے بے حد نفرت ہو چکی تھی اب ''کالے منہ والے پیر'' اور رمضان کو برا بھلا کہنے کے بعد اسماعیل اور افضل کو کوس رہی تھی۔

چودھری رحمت علی اپنے فیصلوں کی بڑی سختی سے پابندی کیا کرتے تھے اور ان کا آخری فیصلہ یہی تھا کہ اگر ولایت شاہ نے خود اپنا ارادہ تبدیل نہ کیا تو وہ گھوڑا

فروخت کرنے پر مجبور ہوں گے۔

ماں، دادی اور چچیوں کے اصرار کے باوجود سلیم نے کھانے کو ہاتھ نہ لگایا۔ وہ چپکے سے اپنے بستر پر جا کر لیٹ گیا۔

پچھلے پہر جب گھر کی عورتیں چرخہ کاتنے اور دودھ بلونے کے لیے اٹھیں تو سلیم کی ماں کو اس کا خالی بستر نظر آیا۔ وہ لالٹین ہاتھ میں لے کر ادھر ادھر تلاش کرنے لگی۔ سلیم کی چچی نے اسماعیل کو جگایا۔ اسماعیل لالٹین پکڑ کر اسے باہر کی حویلی میں تلاش کرنے کے لیے چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ ہنستا ہوا واپس آیا اور بولا ''چلو تمہیں سلیم کو دکھاتا ہوں۔''

سلیم کی ماں نے پوچھا ''فضل کے پاس ہوگا؟''

''نہیں''

''تو پھر کہاں ہے؟''

''چلو میں تمہیں دکھاتا ہوں مجھے ڈر ہے کہ رات اسے سردی نہ لگ گئی ہو!''

سلیم کی ماں اور چچیاں مزید سوالات پوچھے بغیر اسماعیل کے ساتھ چل پڑیں۔

اسماعیل نے مویشی خانے کے اندر داخل ہو کر انہیں لالٹین کی روشنی دکھائی، سلیم گھوڑے کے سامنے کھرلی میں بیٹھا پچھلی دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے سو رہا تھا۔ سلیم کی ماں مامتا سے مغلوب ہو کر آگے بڑھی لیکن گھوڑے کے تیور دیکھ کر اسے پیچھے ہٹنا پڑا۔

اسماعیل نے کہا ''بھابی جی آپ آگے مت جائیں اس وقت گھوڑا اپنے مالک کی

رکھوالی کر رہا ہے یہ مجھے بھی سلیم کے قریب نہیں جانے دیتا۔''

''سلیم! سلیم!! ماں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا اور سلیم جیسے خواب میں بول رہا تھا''نہیں نہیں، یہ میرا ہے، یہ میرا ہے۔

''سلیم! سلیم!!'' ماں کی آواز حلق میں اٹک گئی اس کی آنکھوں میں آنسو اٹد آئے۔

سلیم، ابھی تک خواب کی حالت میں بڑبڑا رہا تھا۔ کہ افضل آ گیا''کیا ہو رہا ہے یہاں؟'' اس نے کہا

اسماعیل نے کہا''افضل آگے بڑھ کر سلیم کو اٹھاؤ۔ مجھے تو یہ گھوڑا اس کے قریب نہیں پھٹکنے دیتا۔''

''ارے سلیم یہاں سو رہا ہے؟''

''سلیم شاید ساری رات یہاں رہا ہے۔''

افضل آگے بڑھا گھوڑے نے نتھنوں سے''کھر رکھرر'' کی آواز نکالی اور اس کے جسم کے ساتھ سر رگڑنے لگا۔ افضل نے سلیم کو جھنجھوڑ کر جگایا اور اٹھا کر گلے لگا لیا۔

اس کے بعد ماں اور چچیاں اسے یکے بعد دیگرے سینے سے چمٹا رہی تھیں۔

جب یہ گھر میں داخل ہوئے تو دادی اماں باہر نکلنے کے لیے اپنا جوتا تلاش کر رہی تھیں سلیم کو دیکھتے ہی انہوں نے کہا''ہے ہے ایسے پیر کو خدا غارت کرے، میرا بیٹا ساری رات سردی میں بیٹھا رہا ہے!''

اس کے بعد سلیم کو کم از کم اس بات کی تسلی ہو چکی تھی کہ خاندان کی بھاری

اکثریت اس کے ساتھ ہے۔

نماز کا وقت ہو چکا تھا سلیم کی ماں نے اس سے کہا ''بیٹا! اب وضو کر کے نماز پڑھو اور خدا سے دعا کرو'' اور سلیم نماز پڑھنے کے بعد انتہائی عجز و انکسار کے ساتھ دعا مانگ رہا تھا ''یا اللہ! میرا گھوڑا نہ جائے یا اللہ رمضان کے پیر کی بھنگ کا نشہ اتر جائے۔''

اس کے بعد وہ بستر پر لیٹ گیا اسے نیند آ گئی وہ سہانے اور میٹھے سپنے دیکھ رہا تھا وہ اپنے گھوڑے پر سوار تھا اور اسے گندم کے لہلہاتے کھیتوں سے گزرنے والی پگڈنڈیوں پر بھگا رہا تھا۔ سکول کے لڑکے اس کے گرد جمع تھے اور وہ انہیں کہہ رہا تھا'' دیکھو میرا گھوڑا!''

''سلیم اٹھو! سلیم! سلیم اٹھو!'' اس نے گھبرا کر آنکھیں کھولیں کھڑکی سے سورج کی روشنی آ رہی تھی۔ مجید نے کہا ''سلیم! جلدی چلو، رمضان کا پیر تمہارا گھوڑا دیکھنے آ رہا ہیں میں ابھی ان کے گھر سے آ رہا ہوں''

سلیم اس کے ساتھ ننگے پاؤں اصطبل کی طرف بھاگا اتنی دیر میں ولایت شاہ حویلی کے پھاٹک میں کھڑا اس کے دادا سے باتیں کر رہا تھا۔۔۔۔۔۔وہ کہہ رہا تھا ''چودھری میں نے آدمی روپے لانے کے لیے بھیج دیا ہے۔''

اسماعیل نے جھک کر سلیم کے کان میں کہا ''بیٹا! فکر نہ کرو، میں نے پیر کا علاج سوچ لیا ہے۔ تم جا کر اسی طرح آنکھیں بند کر کے کھرلی میں بیٹھ جاؤ!''

سلیم نے سراپا التجا بن کر کہا ''پھر کیا ہو گا چچا؟''

''پھر کچھ نہیں ہوگا انشاء اللہ پیر جی خالی ہاتھ جائیں گے بس اب تم جلدی کرو!''

سلیم بھاگتا ہوا اصطبل میں چلا گیا۔

چودھری رحمت علی نے کہا ''چلیں بیٹھک میں بیٹھتے ہیں''

رمضان نے کہا ''پیر جی ذرا گھوڑا دیکھنا چاہتے ہیں''

چودھری رحمت علی نے افضل کو آواز دی لیکن اسماعیل نے آگے بڑھ کر کہا

''ابا جی! افضل باہر چارہ کاٹنے کے لیے چلا گیا ہے۔۔۔۔۔میں دکھا دیتا ہوں پیر جی کو گھوڑا۔۔۔آؤ پیر جی!''

پیر جی رمضان کے ساتھ اصطبل میں داخل ہوئے گھوڑے نے انہیں دیکھ کر کان کھڑے کر لیے۔رمضان جس قدر گھوڑوں کی عربی نسل پہچاننے میں ماہر تھا اسی قدر ان سے دور رہنا پسند کرتا تھا اور اس گھوڑے کے ساتھ اس کی ویسے بھی نہیں بنتی تھی اسماعیل دروازے سے آگے نہ بڑھا رمضان نے کہا ''پیر جی گھوڑا ذرا خطرناک ہے۔''

پیر جی نے کہا ''بھئی ہم نے بڑے بڑے خطرناک گھوڑے دیکھے ہیں، یہ کیا ہے؟''

پیر جی بے تکلفی سے آگے بڑھے۔معاً ان کی نظر سلیم پر پڑی وہ چچا کے ارشاد کی تعمیل میں آنکھیں بند کیے کھرلی میں بیٹھا تھا ''ارے یہ کون ہے؟'' پیر جی نے کہا

رمضان نے جواب دیا ''یہ چودھری رحمت علی کا پوتا ہے اور یہ گھوڑا بھی اسی کا ہے۔''

پیر جی نے کہا'' ارے بھائی یہ تو بچوں کے ساتھ بھی ہلا ہوا ہے، اسے کون خطرناک کہتا ہے۔''

پیر جی بے پروائی سے آگے اور انہوں نے سلیم کا بازو پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے کہا'' کیوں برخوردار۔۔۔!''

پیر جی اپنا فقرہ پورا نہ کر سکے سلیم کو ہاتھ لگانے کی دیر تھی کہ گھوڑے نے ان کے فربہ سینے کا فالتو گوشت جو چلتے وقت اوپر نیچے اچھلا کرتا تھا، اپنے دانتوں کی گرفت میں لے لیا۔

ولایت شاہ کی کیفیت اس ہاتھی سے مختلف نہ تھی جس کی سونڈ شیر کے منہ میں آ چکی ہو۔۔۔۔۔۔وہ اپنی پوری قوت سے چیخ رہے تھے گھوڑے کا یہ اقدام اسماعیل کی توقع کے خلاف تھا۔اس کا یہ خیال تھا کہ گھوڑا صرف ڈرانے دھمکانے یا زیادہ سے زیادہ دولتی مارنے پر اکتفا کرے گا۔۔۔۔۔۔سلیم ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔رمضان اس دلگداز منظر کی تاب نہ لا کر پوری قوت سے دہائی مچا رہا تھا۔

اسماعیل نے جب یہ محسوس کیا کہ معاملہ مذاق کی حد سے آگے گذر چکا ہے تو اس نے آگے بڑھ کر گھوڑے کے نتھنے پر مکا مارا۔گھوڑے کے دانتوں کی گرفت ڈھیلی ہو گئی اور ولایت شاہ بے ہوش ہو کر گر پڑے۔

تھوڑی دیر میں ساری حویلی گاؤں کے مردوں، عورتوں اور بچوں کے بھر گئی پیر جی کو پانچ چھ آدمیوں نے بڑی مشکل سے باہر نکال کر چارپائی پر ڈال دیا کوئی آدھ گھنٹے کے بعد پیر صاحب کو ہوش آیا اور اتنی دیر میں قریباً تمام لوگ یکے بعد دیگرے

ان کے جسم کا زخم خوردہ حصہ دیکھ چکے تھے۔

درد کی شدت اور آدمیوں کے ہجوم میں پیر جی نے اپنے آپ کو قریب المرگ سمجھ کر مریدوں اور مجاوروں سے وصیت کی کہ اس گاؤں میں میرا جنازہ خراب ہوگا، مجھے فوراً میرے گھر پہنچا دو۔ چنانچہ ان کے حکم کی تعمیل کی گئی اور انہیں چارپائی پر ڈال کر ان کے گاؤں پہنچا دیا گیا۔

ولایت شاہ کوئی ڈیڑھ مہینہ بستر پر پڑے رہے۔ ان کے مرید ان کی تیمارداری کے لیے جاتے تھے لیکن ان کے مخالفین دور دراز سے چل کر سلیم کے گھوڑے کو دیکھنے کے لیے آیا کرتے تھے اور اسماعیل ان کے سامنے اس واقعہ کی چشم دید تفصیلات بیان کیا کرتا تھا۔

اس واقعہ کے ایک ہفتہ بعد فجو پہلوان نے اعلان کیا کہ سلیم کا بازو اب بالکل ٹھیک ہے اور اگلے دن سلیم گاؤں کے کھیتوں اور پگڈنڈیوں پر گھوڑے کو بھگا رہا تھا۔



شب برات کی آمد آمد تھی سکول کے پاس ہی ایک دکاندار پھلجھڑیاں، پٹاخے، اور آتش بازی کا دوسرا سامان نمائش کے لیے رکھ دیا کرتا تھا لڑکے آدھی چھٹی کے وقت حلوائی کی دکان پر دھاوا بولنے کی بجائے پٹاخے وغیرہ خرید کر چلایا کرتے تھے سلیم نے اپنے حصے کے پیسے مجید کے حوالے کر دیے تھے اور وہ آدھی چھٹی کے وقت چند پٹاخے، چھچھوندریں اور پھلجھڑیاں وغیرہ خرید لایا تھا۔

آدھی چھٹی کے بعد اردو کا گھنٹہ تھا اور ماسٹر کی غیر حاضری میں لڑکے شور مچا رہے تھے مجید نے آتش بازی کا سامان اپنے بستے میں باندھ رکھا تھا لیکن سلیم اسے دیکھنا چاہتا تھا مجید بار بار اپنا بستہ اس کے ہاتھ سے چھین کر ڈیسک کے اندر رکھتا لیکن وہ پھر نکال لیتا۔

سلیم کے بائیں ہاتھ کے ڈیسک پر ارشد بیٹھا کرتا تھا، اس نے اپنی جیب سے ایک پھلجھڑی نکالی اور اسے آگ لگا کر تمام لڑکوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

سلیم نے بھی اس کی دیکھا دیکھی مجید کے بستے سے ایک پھلجھڑی نکال کر اسے آگ لگا دی ایک اور لڑکے نے ان کی تقلید کی اور تھوڑی دیر میں کمرے کے اندر کئی پھلجھڑیاں چلنے لگیں۔

ارشد نے سلیم کی طرف متوجہ ہو کر کہا "تمہارے بھائی نے بہت سی چھچھوندریں لی ہیں لیکن یہ کسی کام کی نہیں میں کل ایک آنے کی لے گیا تھا، ان میں سے صرف دو چلیں معلوم ہوتا ہے ان کے اندر پسا ہوا کوئلہ بھرا ہے!"

سلیم کو افسوس ہوا کہ یہ بات اسے پہلے کیوں نہیں بتائی گئی تاہم اس نے ایک چھچھوندر نکال کر ارشد کو دکھاتے ہوئے کہا "ان کے اندر کوئلہ نہیں ہے میں نے کئی لڑکوں کو چلاتے دیکھا ہے!"

"لاؤ میں تمہیں دکھاتا ہوں!"

سلیم نے چھچھوندر ارشد کے ہاتھ میں دے دی اس نے ادھر ادھر دیکھ کر اطمینان کے ساتھ دیا سلائی جلائی اور اس کے ایک سرے کو آگ لگا دی۔

کمرے کے باہر ہیڈ ماسٹر صاحب اردو کے ماسٹر سے کہہ رہے تھے، کہ آپ دیر سے آتے ہیں اور لڑکے سب سے زیادہ آپ کی گھنٹی پر شور مچاتے ہیں۔

لڑکے واقعی بہت شور مچا رہے تھے ہیڈ ماسٹر کی جھڑکی کے بعد اردو کے ماسٹر نے انتہائی غیض وغضب کی حالت میں کمرے کا رخ کیا لیکن جونہی انہوں نے کمرے میں پاؤں رکھا ارشد نے بدحواسی کی حالت میں چھچھوندر چھوڑ دی۔

چھچھوندر پہلے میز پر گری، پھر دروازے کا رخ کیا اور اس کے بعد ماسٹر صاحب کی ٹانگوں میں جا چھپی۔ ماسٹر صاحب اچھل اچھل کر اپنی شلوار جھاڑنے لگے یہ نظارہ دیکھ کر لڑکے ایک دوسرے کے پیچھے منہ چھپا کر ہنسنے لگے۔

چھچھوندر سے چھٹکارا حاصل کرتے ہی ماسٹر صاحب الٹے پاؤں واپس مڑے اور ہیڈ ماسٹر صاحب کو بلا لائے۔

ہیڈ ماسٹر صاحب نے اپنا بید ہلاتے ہوئے سوال کیا ''یہ کس کی شرارت ہے؟''

کسی نے جواب نہ دیا

ہیڈ ماسٹر نے دوبارہ گرج کر کہا ''بتاؤ! ورنہ سب کو سزا دوں گا!''

لڑکے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے

آگے بیٹھنے والے لڑکوں کو معلوم نہ تھا کہ یہ چھچھوندر کس نے چلائی ہے اور پیچھے بیٹھنے والے جن لڑکوں کو معلوم تھا، انہیں یہ تسلی تھی کہ ہیڈ ماسٹر کا غصہ اگلی قطار کے چند لڑکوں سے باز پرس کے بعد ختم ہو جائے گی۔ اس لیے وہ خاموش رہے۔ ارشد نے ملتجی نگاہوں سے سلیم کی طرف دیکھا اور سلیم کی مسکراہٹ نے اس کی تسلی کرا دی۔

مجید نے اپنا بستہ ڈیسک سے اٹھا کر گود میں رکھ لیا پھر ادھر ادھر دیکھنے کے بعد آتش بازی کا سامان نکال کر ڈیسک کے اندر چھپا دیا۔

ہیڈ ماسٹر نے چند مرتبہ اپنا بید ہوا میں لہرایا پھر لڑکوں کو کھڑا ہونے کا حکم دیا اور ایک سرے سے مار پیٹ شروع کر دی۔

بلونت سنگھ اگلے ڈیسک پر بیٹھا ہوا تھا، اس لیے سب سے پہلے اس کی باری آئی ہیڈ ماسٹر کے حکم پر اس نے انتہائی بے کسی کی حالت میں اپنا ہاتھ آگے کر دیا۔ پہلا بید کھانے کے بعد وہ چلانے لگا نہیں جی، ماسٹر جی نہیں جی میں نے نہیں چلائی لیکن ماسٹر صاحب اس کی باتیں سننے کے لیے تیار نہ تھے ''ہاتھ بڑھاؤ!'' انہوں نے گرجتی ہوئی آواز میں کہا ''بلونت سنگھ نے دوسرا ہاتھ بڑھا دیا لیکن جب سنسناتا ہوا بید آیا تو اس نے ہاتھ پیچھے ہٹا لیا بید ڈیسک پر لگا اور لڑکے سہم کر رہ گئے۔''

''ماسٹر جی میں نے نہیں چلائی، ان لڑکوں سے پوچھ لیجیے!''

''تو بتاؤ کس نے چلائی ہے؟'' ہیڈ ماسٹر صاحب کا بید پھر ایک بار ہوا میں سنسناہٹ پیدا کرنے لگا ''ہاتھ بڑھاؤ ورنہ!''

بلونت سنگھ نے کانپتا ہوا ہاتھ پھر آگے کر دیا لیکن جب بید آیا تو اس کا ہاتھ خود بخود پیچھے ہٹ گیا بید دوسری مرتبہ ڈیسک پر لگا اور ہیڈ ماسٹر صاحب کا غصہ جنون کی حد تک پہنچ گیا۔

ایک طرف سے سلیم کی سہمی ہوئی آواز سنائی ''ماسٹر جی میں۔۔۔ میں نے چھچھوندر۔۔۔''

''تم؟'' ہیڈ ماسٹر نے چونک کر کہا

''جی!''

''ادھر آؤ!''

ارشد کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن اس کی آواز حلق میں اٹک کر رہ گئی سلیم آگے بڑھ کر ہیڈ ماسٹر کے سامنے کھڑا ہو گیا ہیڈ ماسٹر نے بید اٹھاتے ہوئے کہا ''پہلے کیوں نہیں بتایا تم نے؟''

سلیم نے جواب دینے کی بجائے اپنا ہاتھ آگے کر دیا۔ یکے بعد دیگرے چھ بید رسید کرنے کے بعد ہیڈ ماسٹر کا غصہ پریشانی میں تبدیل ہو رہا تھا سلیم نے باری باری ہاتھ آگے کرنے کی بجائے دونوں ہاتھ پھیلا رکھے تھے اس کے ہونٹ بھنچے ہوئے تھے اور وہ گردن جھکانے کی بجائے ٹکٹکی باندھ کر ہیڈ ماسٹر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ یہ ایک گستاخی تھی کم از کم اردو کا ماسٹر جو ہیڈ ماسٹر کے قریب کھڑا تھا، اسے بہت بڑی گستاخی سمجھتا تھا۔ اگر سلیم ایک بار ''نہیں جی۔۔۔۔ مجھے معاف کر دو جی'' کہہ دیتا تو یہ معاملہ ختم ہو جاتا لیکن اس کی ہمت اور جرأت کو ایک چیلنج سمجھا گیا۔

مجید، ارشد کی طرف دیکھ رہا تھا اس کی آنکھیں انگاروں کی طرح سرخ تھیں، اگر اس کے بس میں ہوتا تو ارشد پر بھوکے شیر کی طرح حملہ کر دیتا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب کے متعلق مشہور تھا کہ اول تو وہ کسی کو مارتے ہی نہیں لیکن جب مارنے پر آتے ہیں تو آدھی درجن یا ایک درجن کے حساب سے بید رسید کرتے ہیں ارشد کو یقین تھا کہ وہ سلیم جیسے لڑکے لیے آدھی درجن کافی سمجھیں گے لیکن جب ہیڈ ماسٹر نے آدھی

درجن پوری کر کے قدرے توقف کے بعد پھر بید اٹھالیا تو ارشد کی قوت برداشت جواب دے گئی اس نے مجید کی طرف دیکھا مجید نے انتہائی حقارت آمیز لہجہ میں کہا ''تم بزدل ہو'' اور ارشد کی رگ و پے میں جیسے بجلی دوڑ گئی وہ چلایا ''ماسٹر جی! سلیم بے قصور ہے چھچھوندر میں نے چلائی تھی۔''

ہیڈ ماسٹر صاحب کا بید رک گیا اور ارشد آگے بڑھ کر سلیم کے قریب کھڑا ہو گیا۔

ہیڈ ماسٹر اور اردو کا ماسٹر انتہائی پریشانی کی حالت میں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

''تم جھوٹ کہتے ہو!'' ہیڈ ماسٹر نے ارشد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا

''سلیم کو معلوم ہے کہ چھچھوندر میں نے چلائی تھی، مجید کو بھی معلوم ہے بہت سے لڑکوں کو معلوم ہے آپ پوچھ لیجیے سلیم مجھے بچانے کے لیے.....''

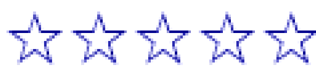
ارشد کی آواز بیٹھ گئی اور اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے

''کیوں مجید؟'' ہیڈ ماسٹر نے اس کی طرف متوجہ ہو کر کہا

''جی...'' سلیم نے جلدی سے مڑ کر مجید کی طرف دیکھا اور اس کی نگاہوں نے مجید کے ہونٹوں پر مہر لگا دی۔

ہیڈ ماسٹر نے کہا ''بتاتے کیوں نہیں؟''

مجید کی خاموشی پر رام لال نے کہا ''ماسٹر جی! ارشد نے چلائی تھی''



لڑکوں کی توقع کے خلاف ہیڈ ماسٹر کچھ دیر بے حس حرکت کھڑے سلیم اور ارشد کی طرف دیکھتے رہے ان کے دل میں غصے کی جگہ پریشانی نے لے لی تھی انہوں نے کہا ''تم بہت نالائق ہو ارشد، اور سلیم تم۔۔۔ تم میرے ساتھ آؤ!''

سلیم ہیڈ ماسٹر کے پیچھے کمرے سے باہر نکلا اور صحن میں سے گزرنے کے بعد دفتر میں داخل ہوا۔۔۔۔ ہیڈ ماسٹر صاحب اپنی کرسی پر بیٹھ کر کچھ دیر اپنی پیشانی پر ہاتھ پھیرتے رہے اور سلیم میز کی دوسری طرف ان کے سامنے کھڑا رہا بالآخر انہوں نے سلیم کی طرف دیکھا اور کہا ''سلیم تمہیں مار کھانے کا شوق تھا؟''

سلیم خاموش رہا ہیڈ ماسٹر صاحب نے پھر کہا ''تم نے جھوٹ کیوں بولا؟''

سلیم نے جواب دیا ''جی چھچھوندر میری تھی اور ارشد نے اسے آگ لگائی تھی، بلونت سنگھ بے قصور تھا!''

''لیکن تم نے ارشد کو بچانے کی کوشش کیوں کی؟''

''ارشد نے جان بوجھ کر شرارت نہیں کی، اس کا خیال تھا کہ چھچھوندر کے اندر مسالے کی بجائے پسا ہوا کوئلہ بھرا ہے۔''

''ادھر آؤ!'' ماسٹر صاحب نے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا

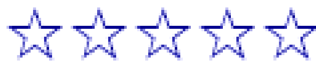
سلیم میز کے اوپر سے چکر کاٹ کر ہیڈ ماسٹر کے قریب کھڑا ہو گیا۔

''اپنے ہاتھ دکھاؤ!''

سلیم نے دونوں ہاتھ آگے کر دیے ہیڈ ماسٹر صاحب افسوس اور ندامت کے ساتھ اس کے ہاتھوں پر بید کے نشان دیکھنے کے بعد بولے ''تم اچھے لڑکے دکھائی

دیتے ہو، معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے تمہارے ہاتھ اچھے کاموں کے لیے بنائے ہیں کبھی کبھی ایک اچھا کام کرتے وقت انسان کے ہاتھ زخمی بھی ہو جاتے ہیں تمہیں آج کی مار کا افسوس تو نہیں؟"

سلیم خاموش رہا اور ہیڈ ماسٹر صاحب قدرے توقف کے بعد بولے "دیکھو بیٹا! اگر آج تم جرأت سے کام نہ لیتے تو شاید ارشد ہمیشہ کے لیے اپنی غلطی دوسروں کے سر تھوپنے کا عادی ہو جاتا۔ تم نے اسے بزدل بننے سے بچا لیا ہے، مجھے امید ہے کہ وہ اس سبق کو نہیں بھولے گا جو آج تم نے اسے دیا ہے۔ کسی دن تم اس بات پر فخر کر سکو گے کہ ایک دفعہ جب تمہارے ایک ساتھی کے پاؤں ڈگمگا رہے تھے۔ تم نے اسے سہارا دیا تھا۔ اگر تم دوسروں کے سامنے اسی طرح اچھی مثال پیش کرتے رہے تو کسی دن میں تم پر فخر کیا کروں گا اچھا اب تم جاؤ۔"



گرمیوں کے دنوں میں بعض لڑکے چھٹی کے بعد گھروں کا رخ کرنے کی بجائے نہر پر چلے جاتے، یہ نہر سکول سے کوئی تین فرلانگ دور تھی دونوں کناروں پر شیشم، جامن اور آم کے درخت تھے۔ لڑکے درختوں کی چھاؤں میں کبڈی کھیلتے اور جب اس سے اکتا جاتے تو نہر میں چھلانگیں لگا دیتے۔ ٹھنڈے پانی میں اچھی طرح ٹھٹھرنے کے بعد وہ باہر نکل کر پھر کوئی کھیل شروع کر دیتے۔

کبھی کبھی تیرنے کا مقابلہ ہو جاتا تمام لڑکے کنارے پر قطار باندھ کر ایک ساتھ

پانی میں کودتے اور دوسرے کنارے کو چھو کر واپس آنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے۔

جب آم اور جامن پکنے کا موسم آتا نہر کے کنارے رونق میں اضافہ ہو جاتا۔ آم بہت سستے بکا کرتے تھے اور جامن ہر شخص مفت اتار کر کھا سکتا تھا۔

پل کے پاس نہر کی ایک چھوٹی سی شاخ نکلتی تھی۔ چونکہ اس کا پانی کم گہرا تھا۔ اس لیے چھوٹی عمر کے لڑکوں کا اس جگہ ہجوم رہا کرتا تھا۔

ایک دن مجید درخت پر چڑھ کر جامن اتار رہا تھا کئی لڑکے جھولیاں تانے نیچے کھڑے تھے جب وہ کسی شاخ کو جھٹکا دیتا تو لڑکے جھولیاں پھیلا کر گرتے ہوئے جامن دبوچنے کی کوشش کرتے جو پھل ان کی جھولیوں سے باہر گر پڑتا اسے وہ نیچے بیٹھ کر چن لیتے۔

جامن کے دوسرے درختوں پر بھی چند لڑکے چڑھے ہوئے تھے اور ہر درخت کے نیچے بچوں کی ٹولیاں موجود تھیں۔

سلیم چند لڑکوں کے ساتھ نہر میں نہا رہا تھا۔ مہندر تیرنا نہیں جانتا تھا اس لیے کبھی کبھی کنارے پر اگی ہوئی گھاس پکڑ کر پانی میں چند ڈبکیاں لگا لیتا اور اس کے بعد کنارے پر کھڑا ہو کر دوسرے لڑکوں کی طرف دیکھنے لگتا۔

کندن لال نہر سے باہر نکل کر مہندر کے قریب کپڑے پہن رہا تھا کہ موہن سنگھ کو شرارت سوجھی اس نے پیچھے سے دبے پاؤں آ کر اسے دھکا دے دیا کندن لال نے سنبھلنے کے لیے مہندر کا سہارا لیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں لڑکھڑاتے ہوئے

پانی میں آرہے ہے کندن لال تیرنا جانتا تھا اس لیے وہ کسی حادثے کے بغیر باہر نکل آیا مہندر سنگھ کو پانی میں ہاتھ پاؤں مارتے اور غوطے کھاتے دیکھ کر لڑکے شور مچانے لگے سلیم اس وقت کنارے سے پانچ چھ گز دور تھا وہ تیزی سے تیرتا ہوا اس کی طرف بڑھا مہندر نے اسے قریب آتا دیکھ کر پانی کے ساتھ جدوجہد کا ارادہ ترک کر دیا اور اپنے دونوں ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیے۔ سلیم بروقت اس کا ہاتھ نہ پکڑ سکا اور وہ ایک لمحہ کے لیے پانی میں چھپ گیا۔

''ڈوب گیا۔۔۔۔ ڈوب گیا۔۔۔۔۔ مہندر ڈوب گیا!'' لڑکے شور مچا رہے تھے اچانک مہندر سنگھ ہاتھ پاؤں مارتا ہوا پانی کی سطح پر ظاہر ہوا اور سلیم نے اس کے سر کے بال پکڑ لیے سلیم تیرنا جانتا تھا لیکن ڈوبتے کو بچانے کے لیے طاقت اور تجربے کی ضرورت تھی مہندر نے بدحواسی کی حالت میں اپنے ہاتھ اس کی گردن میں ڈال دیے ار دونوں پانی میں ڈبکیاں کھانے لگے چند غوطے کھانے کے بعد سلیم کا ہاتھ کنارے کی گھاس تک پہنچ گیا اتنی دیر میں مجید، بلونت سنگھ اور دوسرے لڑکے درختوں سے اتر کر اس طرف بھاگ رہے تھے۔ بلونت سنگھ نے اپنے بھائی کا نام سنتے ہی آٹھ دس فٹ اونچی ٹہنی سے چھلانگ لگا دی تھی لیکن ان کے پہنچنے سے پہلے سلیم مہندر سنگھ کو خطرے کی زد سے باہر لا چکا تھا۔ پانی سے باہر نکل کر اپنے ہوش و حواس پر قابو پاتے ہی مہندر سنگھ نے کندن لال کی طرف دیکھا اور اسے گالیاں دینے لگا۔

مجید اور بلونت سنگھ کسی تمہید کے بغیر کندن لال پر پل پڑے۔ کچھ اور لڑکوں نے

بھی ان کی تقلید کی اس پر ابتدائی حملہ اس قدر شدید تھا کہ کندن لال کو صفائی کا موقع ہی نہ ملا۔۔۔اور جب لڑکوں کے ہاتھ ذرا سست ہوئے تو اس کی آواز اس کے قابو میں نہ تھی۔۔۔۔سلیم نے لڑکوں کو ادھر ادھر دھکے دے کر اسے بچانے کی کوشش کی وہ چلاتا رہا۔ارے اسے کیوں مارتے ہو دھکا دینے والا تو موہن سنگھ تھا لیکن سلیم کی چیخ و پکار کی صرف اس وقت قابل توجہ سمجھا گیا جب کندن لال اچھی طرح پٹ چکا تھا۔۔۔پھر جب موہن سنگھ کی تلاش شروع ہوئی تو وہ غائب تھا۔

اگلے دن جب سلیم سکول سے واپس آتے ہوئے مہندر کے گاؤں سے گزر رہا تھا تو اس نے اپنے مکان کے قریب پہنچ کر سلیم کا بازو پکڑ لیا ''چلو سلیم ماں کہتی تھی کہ اسے ضرور لانا''

سلیم نے تذبذب کی حالت میں مجید اور اپنے دوسرے ساتھیوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ''نہیں مہندر پھر سہی!''

بلونت سنگھ نے سلیم کا دوسرا بازو پکڑتے ہوئے کہا ''چلو نا سلیم ہمارے آم بہت میٹھے ہیں سچ کہتا ہوں میری ماں نے تمہارے لیے بہت سے آم رکھے ہوئے ہیں مجید تم بھی چلو!''

مجید کچھ کہنے کو تھا کہ مہندر کی ماں دروازے میں نمودار ہوئی اور سلیم اور مجید کی طرف غور سے دیکھنے کے بعد پوچھا ''تم میں سے سلیم کون ہے؟''

پیشتر اس کے کہ سلیم جواب دیتا مہندر نے کہا ''ماں یہ ہے سلیم یہ ہمارے گھر نہیں آتا تھا''

مہندر کی ماں نے آگے بڑھ کر پیار سے دونوں ہاتھ سلیم کے سر پر رکھ دیے اور کہا ''بیٹا جیتے رہو۔ میں آج تمہارے گھر بھی گئی تھی چلو تھوڑی دیر میرے گھر بیٹھو پھر چلے جانا اور یہ؟'' اس نے مجید کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ''تمہارا بھائی ہے نا، بیٹا تم بھی چلو۔۔۔۔تم سب چلو!''

تھوڑی دیر بعد سلیم اور اس کے گاؤں کے باقی لڑکے مہندر کے مکان کے صحن میں جامن کے درخت کے نیچے بیٹھ کر بے تکلفی سے آم کھا رہے تھے۔ مہندر سنگھ کی بہن جو اس سے دو سال چھوٹی تھی، چند قدم دور کھڑی ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔

دو تین آم کھانے کے بعد جب سلیم ٹوکری سے ہٹ کر دور بیٹھ گیا تو مہندر کی ماں نے آگے بڑھ کر ٹوکری سے ایک آم نکال کر اسے دیتے ہوئے کہا ''یہ کھاؤ بیٹا بہت میٹھا ہے، لو!''

سلیم نے اس کے ہاتھ سے آم لے لیا۔ کم سن لڑکی نے آگے بڑھ کر ٹوکری سے ایک اور آم نکالتے ہوئے کہا ''یہ بھی بہت میٹھا ہے، لو!''

ساتھیوں کی ہنسی نے سلیم کو قدرے پریشان کر دیا لڑکی نے تامل کے بعد پھر کہا ''لو نا! سچ کہتی ہوں، بہت میٹھا ہے۔''

لڑکی کی ماں نے کہا ''لے لو بیٹا! یہ تمہاری بہن ہے۔''

سلیم نے لڑکی کے ہاتھ سے آم لے لیا اور وہ خوش ہو کر بولی ''تمہارا نام سلیم ہے نا!''

''ہاں!'' سلیم نے آہستہ سے جواب دیا

''میرا نام بسنت ہے!''

سلیم خاموش رہا لڑکی کچھ سوچ کر بولی ''تم نے مہندر کو نہر سے نکالا تھا نا؟''

سلیم کی خاموشی پر مہندر نے جواب دیا ''ہاں بسنتی! اس نے مجھے نکالا تھا۔ اسے میٹھے میٹھے آم دو نا!''

لڑکی نے جھٹ دو آم نکال کر سلیم کو پیش کر دیے ''بس میں بہت کھا چکا ہوں'' سلیم نے عذر پیش کیا۔

سلیم کے انکار پر بسنت نے مایوس ہو کر آم پھر ٹوکری میں رکھ دیے اور کچھ سوچنے کے بعد بھاگتی ہوئی مکان کے اندر چلی گئی جب وہ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک گڑیا تھی ''لو یہ لے لو'' اس نے گڑیا سلیم کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا لڑکے کھلکھلا کر ہنس پڑے لیکن لڑکی ان کی ہنسی سے لاپروا ہو کر گڑیا دینے پر اصرار کر رہی تھی اس کی ماں نے کہا ''پگلی! بھائیوں کو گڑیا نہیں دیا کرتے۔''



جولائی کا مہینہ تھا اسکول میں گرمیوں کی چھٹیاں ہو چکی تھیں ایک دن سلیم گاؤں کے باہر آم کے باغ میں چارپائی پر لیٹا گہری نیند سو رہا تھا، ایک کتاب اس کے سرہانے پڑی ہوئی تھی، مجید بھاگتا ہوا آیا اور سلیم کے بازو پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے بولا ''ارے اٹھو!''

سلیم نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور اس کا ہاتھ جھٹک کر پھر آنکھیں بند کر

لیں۔

''ارے پوستی اٹھتے ہو یا نہیں؟''

''مجید کے بچے مجھے تنگ نہ کرو!'' سلیم کروٹ بدلتے ہوئے بڑبڑایا۔

''ارے اٹھتے ہو یا نہیں؟''

سلیم نے جواب دینے کی بجائے تکیے میں منہ چھپالیا۔

مجید نے چارپائی کو ایک طرف سے اٹھاتے ہوئے '' ایک۔۔۔۔ دو۔۔۔۔۔تین!'' کہا اور سلیم لڑھکتا ہوا زمین پر آ رہا۔ وہ غضبناک ہو کر اٹھا اور آس پاس کوئی اور کارآمد چیز نہ پا کر دونوں ہاتھوں میں آموں کی سوکھی ہوئی گٹھلیاں لے کر مجید کے پیچھے بھاگا۔ مجید کبھی ایک اور کبھی دوسرے درخت کی آڑ کر اپنے آپ کو بچا رہا تھا لیکن جب سلیم نے ایک درخت کے نیچے سے دو کچے آم اٹھا لیے تو وہ چلایا ارے ٹھہرو! ادھر دیکھو!!

''ادھر میں بعد میں دیکھوں گا'' سلیم نے یہ کہتے ہوئے ایک آم اس کی طرف دے مارا مجید نے درخت کی آڑ میں چھپ کر اپنے آپ کو بچالیا۔

''ارے، میں تمہارے دوست کو لے کر آیا ہوں' مجید نے پھر درخت کی اوٹ سے سر نکالتے ہوئے کہا ''مجھے معلوم ہے''

''ارے تمہارے پیچھے ارشد کھڑا ہے ادھر دیکھو!''

ارشد کا نام سن کر سلیم نے جلدی سے پیچھے دیکھا اور اس کا غصہ پریشانی اور مسرت کے ملے جلے جذبات میں تبدیل ہو کر رہ گیا وہ آم اور گٹھلیاں زمین پر

پھینک کر اپنے ہاتھ جھاڑنے لگا۔

''بھئی خوب سوتے ہو'' ارشد نے آگے بڑھ کر مسکراتے ہوئے کہا

''نہیں میرا خیال تھا کہ مجید بلا وجہ تنگ کر رہا ہے۔ اگر تم جگاتے تو میں شاید تمہاری آواز سن کر ہی اٹھ بیٹھتا'' یہ کہہ کر سلیم نے مالی کو آواز دی ''دیکھو مالی سیندوری اور گولے آم جھاڑ کر پانی میں ڈالو لیکن ٹھہرو پہلے ان کے لیے کھانا لے آؤ!''

ارشد نے کہا ''بھائی کھانا تو میں گھر سے کھا کر چلا تھا''

''اچھا پانی تو پیو گے نا؟''

''پانی مجید نے پلا دیا ہے!''

سلیم مالی کی طرف متوجہ ہوا ''اچھا بھئی تم آم اتار دو!''

مالی نے جواب دیا ''جی گولے اور سیندوری آم تو میں نے صبح اتار کر گھر بھیج دیے تھے، اب کسی اور درخت سے اتار دیتا ہوں!''

''نہیں! ہم دوسرے باغ میں چلتے ہیں!''

مجید نے کہا ''سلیم! اگر ارشد کو بہت ہی اچھے آم کھلانا چاہتے ہو تو چلو سادھو کے باغ میں چلتے ہیں اس کے آم ہمارے سیندوری اور گولے سے بھی اچھے ہیں۔''

مالی نے کہا ''ہاں جی! ویسے آم سارے علاقے میں کسی باغ کے نہیں''

سلیم نے کہا ''لیکن وہ دور ہے!''

''ہم پیدل نہیں جائیں گے، گھوڑوں پر آدھ گھنٹے کا راستہ ہے''

سلیم نے پوچھا ''کیوں ارشد گھوڑے پر سواری کر لو گے؟''

’’بھئی سچ پوچھو تو مجھے آدموں سے زیادہ گھوڑے کی سواری کا شوق ہے لیکن تمہارے ولایت شاہ والے گھوڑے سے ڈرتا ہوں!‘‘

سلیم نے کہا ’’اب میرا گھوڑا شرارت نہیں کرتا، پھر بھی تمہارے لیے مجید کی گھوڑی ٹھیک رہے گی۔ مجید تم چچا افضل کی گھوڑی لے لو!‘‘

مجید بولا ’’بھئی چچا افضل سے تم کہو!‘‘

’’چلو!‘‘

کڑا کے کی دھوپ اور اس کے ساتھ غضب کی گھمس تھی، ارشد کے ساتھ گھر کا رخ کرتے ہوئے سلیم اور مجید دونوں یہ محسوس کر رہے تھے کہ ایسی گرمی میں شاید افضل گھوڑی پر سواری کی اجازت نہ دے۔

چچا افضل حویلی کے دروازے کے سامنے بڑ کے درخت کے نیچے کھاٹ پر بیٹھا ہیر پڑھ رہا تھا۔ اس کے قریب دوسری چارپائی پر شیر سنگھ لیٹا ہوا تھا۔ چبوترے کے دوسری طرف اسماعیل کے گرد آٹھ دس آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ کچھ دیر گفتگو کے لیے موزوں الفاظ سوچنے کے بعد سلیم افضل کے قریب جا کھڑا ہوا۔ افضل کسی لفظ پر رکا اور سلیم نے جھک کر کتاب پر نگاہ ڈالتے ہوئے اس کی اصلاح کر دی اور پھر اپنی کہانیوں کی کتاب شیر سنگھ کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا:

’’لو چچا تم بھی پڑھو!‘‘

شیر سنگھ نے بے تکلفی سے کتاب کھولی اور افضل کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگا۔

سلیم نے کہا ’’چچا عینک لگا لو نا؟‘‘

''نہیں بھئی گرمی ہے، مجھے ایسے ہی پڑھنے دو۔ پرسوں عینک سے آنکھیں دکھنے لگی تھیں۔ تم نے خواہ مخواہ میرے دو روپے خرچ کرا دیے!''

''اچھا چچا پڑھونا!''

اس نے پڑھنا شروع کیا ''ڈولی چڑھدیاں ماریاں ہیر چیکاں۔۔۔'' اور ارشد جو ابھی تک چبوترے سے پنچے مجید کے قریب کھڑا تھا، اپنے منہ پر دونوں ہاتھ رکھ کر ہنسی ضبط کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

سلیم نے کہا ''چچا یہ تو اردو کی کہانیوں کی کتاب ہے!''

''کوئی بات نہیں!'' اس نے بے پروائی سے جواب دیا

سلیم نے افضل کی طرف متوجہ ہو کر کہا ''چچا جی! ذرا آپ کی گھوڑی باہر لے جاؤں؟''

''اس گرمی میں! خبردار اسے ہاتھ لگایا تو! اپنے گھوڑے کو دن میں دو بار نہلاتے ہو اور میری گھوڑی میں جیسے جان ہی نہیں!''

''چچا! شہر سے میرا دوست آیا ہے باغ میں اچھے آم مالی نے جھاڑ لیے ہیں اور ہم سادھو کے باغ میں جانا چاہتے ہیں''

''دوست کے لفظ کا مفہوم افضل سے زیادہ کون سمجھتا تھا۔ اس کے لہجے میں اچانک ملائمت آ گئی'' کہاں ہے تمہارا دوست؟ اس نے سوال کیا

''وہ کھڑا ہے''سلیم نے ارشد کی طرف اشارہ کیا

''ارے پڑھے لکھے لوگ دوستوں کی آؤ بھگت اسی طرح کیا کرتے ہیں؟ آؤ

بھئی ادھر آؤ!''

ارشد چبوترے پر چڑھ کر جھجکتا ہوا آگے بڑھا

''بیٹھ جاؤ بیٹا!''

ارشد شرماتے ہوئے افضل کے قریب بیٹھ گیا

''جاؤ سلیم شربت لاؤ!''

''جی میں نے پانی پی لیا ہے۔''

''بھئی آج کل پیاس جلدی لگ جاتی ہے جاؤ سلیم!''

سلیم بھاگتا ہوا شربت لے آیا اور ارشد کو ایک گلاس پینا پڑا۔

افضل نے کہا ''کیوں برخوردار! گھوڑے کی سواری آتی ہے نا تمہیں؟''

ارشد نے جواب دیا ''جی بہت معمولی، کبھی کبھی کسی گاؤں کے مریض ابا جی کے لیے گھوڑا بھیج دیتے ہیں تو میں سواری کر لیتا ہوں لیکن گھوڑا اگر شریر ہو تو میں اس کے پاس نہیں جاتا ابھی تک مجھے اچھی طرح سواری نہیں آتی۔''

''سلیم تمہیں سکھا دے گا لیکن پہلے دن ہماری چھوٹی گھوڑی پر سواری کرنا تم ڈاکٹر شوکت کے لڑکے ہو نا؟''

''جی''

''بھئی وہ تو ہمارے بڑے مہربان اور بھائی جان کے دوست ہیں۔ سلیم! اپنے دوست کے لیے گھوڑے کی زین اچھی طرح کس دینا۔''

''بہت اچھا چچا جان!''

سلیم اور مجید تھوڑی دیر میں گھوڑوں پر زینیں ڈال کر آئے۔

جب وہ سوار ہو رہے تھے تو افضل نے کہا ''دیکھو بھئی گھوڑوں کو تیز نہ چلانا تمہارا ساتھی انجان ہے اور آج گرمی بھی بہت زیادہ ہے شام تک شاید آندھی یا بارش آئے، اس لیے جلدی آنا!''

''بہت اچھا چچا جان! ہم جلدی آئیں گے''

باغ میں پہنچ کر سلیم، مجید اور ارشد نے گھوڑوں کی زینیں اتار کر انہیں درختوں کے ساتھ باندھ دیا۔ مالی سے آم لے کر پانی کی بالٹی میں ڈال دیے اور خود نہر میں نہانے لگے۔ نہانے کے بعد انہوں نے نہر کے کنارے بیٹھ کر آم کھائے اور کچھ ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔

مجید کو کئی دنوں کے بعد افضل کی گھوڑی پر سواری کا موقع ملا تھا۔ اس نے چپکے سے اٹھ کر گھوڑی پر زین ڈالی اور اس پر سوار ہو گیا۔

''کہاں جا رہے ہو؟'' سلیم نے سوال کیا

''ذرا چکر لگاتا ہوں آؤ تم بھی!''

سلیم نے جواب دیا ''نہیں بھئی میں گھوڑے کو نہیں بھگاؤں گا'' لیکن جب مجید نے قریب ہی ایک کھیت میں گھوڑی کو بھگاتے ہوئے دو تین بار پانی کی کھائی کے اوپر سے چھلانگ لگا کر ارشد سے داد حاصل کی تو سلیم اپنے فیصلے پر قائم نہ رہ سکا، اس نے جھٹ سے اپنے گھوڑے کو لگام لگا دی اور زین کے بغیر اس پر سوار ہو گیا۔

ارشد کے لیے دو سواروں کا مقابلہ دلچسپی سے خالی نہ تھا وہ حیرت زدہ ہو کر ان کی